ایک طالب علم

کی ڈائری

یعنی اس کا علمی سفر

اس سفر کے رفقاء، معاونین اور محسنین
اور ان کے کچھ حالات و واقعات
اور جذباتِ تشکّر و امتنان

مولانا محمد عبداللہ طارق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک طالب علم کی ڈائری

مولانا محمد عبداللہ طارق

ایک
طالب علم
کی ڈائری

یعنی اس کا علمی سفر

اس سفر کے رفقاء، معاونین و محسنین
اوران کے کچھ حالات و واقعات
اورجذباتِ تشکّر و امتنان

مولانا محمد عبداللہ طارق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب : ایک طالب علم کی ڈائری
یعنی اس کا علمی سفر
مصنف : مولانا محمد عبداللہ طارق
کل صفحات : ۹۲
اشاعت اول : ۲۰۲۳ء
باہتمام : شاہد انور
مطبع : European Printers, New Delhi
کمپوزنگ : محمد ارشد عالم
تزیین : ترسیل پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس
قیمت : Rs.100.00(INDIA)
USD.$ 3.00(Abroad)

Published by ناشر

بختیار پبلیکیشنز
Bakhtiyar Publications

S/9A, Str. No.18, Opp.Mumtaz Masjid, Nafees Road,
Joga Bai Ext., Jamia Nagar, New Delhi - 110025
email : bakhtiyarpublications@gmail.com
Cell / Whatsapp : +91 9953122348

فہرست مضامین

دوسرا باب

تیسرا باب

ارشادِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم:

تواضَعُوا لِمَن تَعلَّمون منه، و تواضَعُوا لِمَن تُعلِّمونه، ولا تكونُوا جبَابِرَةَ العلماء

(رواہ الخطیب البغدادی فی الجامع عن أبی ھریرہؓ والصحیح أنہ من قول عمرؓ)

''جن سے تم علم حاصل کرتے ہو ان کے سامنے تواضع سے پیش آیا کرو اور جن کو تم تعلیم دیتے ہو ان سے بھی تواضع سے پیش آیا کرو اور سخت گیر اور گھمنڈی علماء نہ بن جاؤ''

امام ذہبیؒ اور مناویؒ کے رائے ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا قول ہے

کسی بڑے عالم کا مقولہ ہے:

العِلمُ لا یُعطِیکَ بَعْضَہ حتی تُعطِیَہ کُلَّک

"علم اپنا کچھ حصہ بھی تمہیں اس وقت تک نہیں دے گا جب تک کہ تم اپنا کل کا کُل اس کے حوالے نہ کردو"

وہ جو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، وہی لکھنے پڑھنے کا شوق ہے
ترا نام لکھنا کتاب میں ، ترا نام پڑھنا کتاب میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ اولین

کوئی مسافر اپنے سفر کے تجربات اگر قلم بند کر کے محفوظ کر دے تو بعد کے مسافروں کو اس سے آسانی ہوتی ہے اور اسکے تجربات سفر سے ان کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، راہ کی ٹھوکروں پھسلنوں اور دلدلوں کا پتہ چل جاتا ہے، نفع بخش مواقع سے واقفیت ہو جاتی ہے اور راستے کی مسافر نواز شخصیات کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔

اپنے محسنوں کو یاد کرنا اور انکی خوبیوں کا ذکر کرنا بھی شکر گزاری کا ایک حصہ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اُذْکُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ (اپنے گزرے ہوئے لوگوں کی خوبیوں کو یاد کیا کرو)

(رواه أبو داود والترمذي والطبراني والحاكم والبيهقي عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما- كما في الجامع الصغير مع شرحه للمناوي علیہ السلام ١/٤٥٧)

اسی طرح نیک لوگوں کا ذکر تذکرہ اللہ کی رحمت کے نزول کا ذریعہ ہوتا ہے۔

حضرت سفیان بن عُیَیْنہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگوں کا قول ہے کہ عند ذکرِ الصالحین

تَنزِلُ الرحمة (صالح لوگوں کے تذکرے کے وقت اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔)

(المقاصد الحسنۃ للسخاوی علیہ الرحمۃ ص ۴۲۹، رقم ۷۲۰)

میرا مضمون ''مظاہر علوم کے دور طالب علمی کی یادیں'' جب آئینۂ مظاہر علوم میں قسط وار شائع ہوا اور پھر وہ سن ۱۴۳۹ھ-۲۰۱۸ء میں کتابی شکل میں چھپا تو بہت سے حضرات نے پسند بھی کیا اور مزید یہ تقاضا بھی کیا کہ ابھی یہ داستان نامکمل ہے، دور طالب علمی کے یہ درمیانی واقعات ہیں، اس کا شروع ابھی باقی ہے اور انھوں نے کہا کہ آپ ہی کہتے ہیں کہ جو حقیقی طالب علم ہے وہ ساری عمر ''طالب علم'' ہی رہتا ہے تو اس کتاب میں درج شدہ داستان کی ابھی تو کم از کم دو قسطیں باقی ہیں، (۱) آغاز طالب علمی سے مظاہر علوم کے داخلے تک (۲) دوسری قسط کتاب مذکور ہے (۳) اور تیسری قسط اِس دوسرے دور کے بعد کی ''طالب علمی'' کی آج تک کی داستان۔

چنانچہ ان کا یہ مطالبہ معقول ہے، میں نے ان تین ادوار کے تین باب بنا دئے ہیں۔دوسرے یہ کہ اس دَور تالہ بندی (لاک ڈاؤن اور اَن لاک) میں ملی اس گوشہ گیری میں فرصت کا یہ بہتر استعمال بھی ہے اسلئے میں نے یہ چند صفحات قلم بند کر دیے ہیں اور حقیقت یہ ہے ان صفحات میں میرا بڑا اور اہم مقصد اپنے محسنوں خصوصاً علمی محسنوں کو یاد کرنا اور ان کے محاسن کا تذکرہ کرنا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے اور اُن مرحومین سے ہم نے جو علوم۔بقدر ظرف۔ لئے ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے آمین

جلوے بقدرِ تابِ نظر دیکھتے رہے
کیا دیکھتے ہم ان کو مگر دیکھتے رہے

کتاب کا یہ نام اس کے بیشتر مضامین کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ لیکن ضمناً اس میں بہت سی چیزیں مصنّفین اور ناشرینِ کتب کے مطلب کی بھی آ گئی ہیں۔ یہ کتاب سن ۲۰۲۰ء میں تیار ہو گئی تھی، اشاعت کے لئے دینے میں تاخیر ہوئی اور مزید نہ معلوم کب تک التوا کا شکار رہتی اگر اردو کے قادر الکلام شاعر، دلّی کی ٹکسالی زبان کے نمائندہ اور کئی شعری مجموعوں کے خالق عزیز مکرم شاہدؔ انور صاحب حفظہ اللہ اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہ کرتے، میں نے پرانی کمپوزنگ کے بعد کچھ اضافے کئے تھے ان کو انھوں نے خود کمپوز کیا اور تصحیح و تزیین کر کے موجودہ شکل تک پہنچایا۔ جزاہ اللہ خیراً۔

بلا شبہ ہر کام کا اللہ تعالیٰ کے یہاں اک وقت معیّن اور اَجَلٌ مُسمّٰی ہے۔

۹ر شعبان ۱۴۴۴ھ

۲ر مارچ ۲۰۲۳ء

جمعرات

محمد عبد اللہ طارق

بختیار منزل، نزد ممتاز مسجد

جوگا بائی، جامعہ نگر

نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

موبائل و واٹس ایپ :

09899153495

پہلا باب

اس سفر کا آغاز

آپ اگر اپنے علمی سفر کا آغاز تلاش کرنا چاہیں تو یہ آسان نہیں ہے، ماں کی گود میں سن شعور سے بہت پہلے یہ دَور شروع ہو جاتا ہے، اپنی قدیم ترین یادوں کو سوچیں گے تو یہ دور اس سے بھی پہلے کا نکلے گا۔ آخر بچوں کے کان میں اذان ہم خواہ مخواہ بے فائدہ تو نہیں دیتے، وہ اذان بھی ہماری فطرت اور ہماری روح کو اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم دینے ہی کے لئے تو ہوتی ہے، وہ تعلیم ہماری فطرت میں رچ بس جاتی ہے، یہ اس سفر کا آغاز ہے۔

پھر ہم ماں سے جب مادری زبان سیکھتے ہیں تو اسکو شاید کوئی علمی سفر نہ کہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ساری عمر ہم جس زبان کے ذریعے اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں وہ زبان تو اسی دور میں سیکھی جاتی ہے، لکھنے پڑھنے کی زبان آپ کی آج جو بھی کچھ ہو لیکن اس زبان تک بھی تو آپ کو مادری زبان ہی نے رسائی بخشی ہے، آپ کے استاد نے آپ کی مادری زبان کے ذریعے ہی بتایا تھا کہ اس لفظ کے معنی یہ ہیں، آپ اپنی عربی تحریر میں جس پھل کو ''تُفّاح'' اور انگریزی تحریر میں جس پھل کو ''ایپل'' لکھتے ہیں یہاں تک آپ کو رسائی لفظ ''سیب'' ہی نے تو دی ہے اور یہ لفظ آپ نے ماں سے یا ماں کے فراہم کردہ ماحول ہی سے سیکھا تھا۔ اسی لئے ہر شخص کی اصل زبان مادری زبان ہوتی ہے پدری زبان تو کوئی نہیں کہتا۔ آپ کے والد خواہ دہلی یا لکھنو کے ہوں لیکن والدہ محترمہ اگر بہار کی ہیں تو (باشندگانِ بہار

سے معذرت کے ساتھ) آپ کی تذکیر و تانیث ہمیشہ لڑکھڑائی اور ڈگمگائی رہے گی اِلّا ماشااللہ۔

احسان مندی

لہٰذا جب جب آپ اپنے اساتذہ کو یاد کریں تو سب سے پہلے تو ازان کی تعلیم دینے والے معلم کائنات اللہ رب العالمین کو یاد کیجئے اور اس کا شکر کیجئے پھر پیامبر جن و بشر حضرت نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیجئے اور چند مرتبہ شکر گزاری کے یہ الفاظ کہئے: جزي الله عنآ (سيّدنا) محمداً صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ما هوأهله (الطبراني، أبو نعيم في الحلية، الخطيب، ابن النجار عن ابن عباس رضي الله عنهما. مجمع الزوائد ۱۰/ ۱۶۳، كنز العمال ۲/ ۱۵۱، ط حيدر آباد الثانية ۱۹۵۰ء) یعنی اے پروردگار! ہماری طرف سے حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے شایانِ شان بدلا عطا فرما۔ اوران کے بعد دیگر اساتذہ سے پہلے اپنی اماں جان کا احسان یاد کیجئے، ان کے شکر گزار رہئے ان کے احسان کا بدلہ دینے کی کوشش کیجئے جو آپ کے مذہب آپ کے سماج آپ کی انسانیت اور شرافت کا بھی حکم ہے۔

ضروری نہیں کہ یہ ماں بہت پڑھی لکھی بلکہ یوں کہئے ذرا بھی پڑھی لکھی ہو، بالکل انگوٹھا ٹیک بھی ہے تو ہوا کرے، آپ کی تو ٹیچر ہے، استانی ہے، معلمہ ہے، آج آپ لکھ پڑھ کر Ph.D. ہوگئے تو بلا سے لیکن استاد کا درجہ تو استاد ہی کا رہے گا۔ آج آپ علامۂ زماں، مفتی دوراں، شیخ الحدیث اور شیخ التفسیر ہوگئے تو کیا ہوا آپ شاگرد تو اسی اَن پڑھ بڑھیا کے ہیں، جب ناک پونچھنی نہیں آتی تھی، استنجا کرنا نہیں آتا تھا تو کس نے سکھایا تھا؟ بھول گئے جب آپ اسی بڑھیا سے پوچھتے تھے کہ امی! میرا سیدھا ہاتھ کون سا ہے؟

اسی طرح ہمارا وہ بہت کم تنخواہ پانے والا کم علم استاد جس نے الف با تا پڑھائی

تھی، جس نے A.B.C.D سکھائی تھی اسکا سماجی مرتبہ کیا ہے، اس کی مالی حالت کیا ہے، اس کا مکان کے منزلہ ہے، اس کے بچے کیسے ہیں، کیا کرتے ہیں، معاشرے میں ان کا اور خود اس بڈھے ماسٹر کا مقام کیا ہے؟ ان تمام باتوں سے نظر ہٹا کر یہ دیکھئے کہ وہ آپ کا استاد ہے آپ کا محسن ہے۔

''کیا کہا؟؟'' ''وہ تو اپنی نوکری کرتے تھے'' خبردار! یہ کمینگی کی باتیں ہیں، زبان پہ آنا تو دور کی بات ہے خیال میں بھی یہ بات آگئی ہو تو اللہ سے معافی مانگئے توبہ کیجئے، ایسی ہی گھٹیا سوچ کے لوگ ہوتے ہیں جو کہدیتے ہیں کہ ''ماں باپ کا ہمارے اوپر کیا احسان ہے ہمیں پیدا کیا تو کیا کیا؟ وہ تو اپنی غرض کو ملتے تھے، ہمیں وجود میں لانے کے لئے تھوڑی ملتے تھے!'' نعوذ باللہ! توبہ توبہ! آپ ذرا اپنی بات یا اپنے کسی عزیز یا دوست کی حالت دیکھئے جس کے یہاں شادی کے دس سال بعد تک اولاد نہ ہوئی ہو! ملتے تو وہ بھی رہتے ہیں، کیا کیا جتن نہیں کرتے وہ اولاد کے لئے؟ علاج، دعاء، وظیفے تعویذ، گنڈے، جائز و ناجائز تدبیریں، اور پھر پیدا ہو جانا ہی نہیں ہے، پیدائش کے بعد سے پاؤں چلنے تک، اسکول اور مدرسہ جانے تک، کلیات و جامعات اور یونیورسٹی تک، شادی تک، آخر کس کس احسان کو آپ ایسی جملہ بازیوں میں اُڑادیں گے؟ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ؟

میری زبان کا منبع ومخرج

میری نانی کٹھور ضلع میرٹھ کی تھیں، شادی ہوئی ہاپوڑ کے قریب ایک قریے میں، میری والدہ کی پیدائش وہیں کی ہے، والدہ کی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن زبان اور ہر ہر موقع کے الفاظ، محاورے، تمثیلات بڑی غضب کی استعمال کرتی تھیں، اُن کے پاس ہر موقع کے الفاظ کا ذخیرہ وافر مقدار میں موجود تھا، یہ الگ بات ہے کہ زمانے کی رفتار نے انمیں سے

کچھ کو متروک اور قدیم قرار دیدیا ہے مثلاً میری نانی ''جب'' کو ''جد'' بولتی تھیں، اہل لغت اسکو ''جب'' کا قدیم تلفظ قرار دیتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں اس کو متروک قرار دیا گیا ہے۔

جس پھل کو ہم ''کیلا'' کہتے ہیں وہ اسے ''کیلے کی پھلی'' کہتی تھیں، گویا کیلا تو درخت ہوا، اسی طرح آم کو وہ ''آنبی'' بولتی تھیں اور آم یا آنب درخت کا نام ہے۔ ان کے علاوہ بھی ہم نے بہت سے پرانے لوگوں کو آنبی کہتے سنا ہے، کچا آم ہو یا پکا سب کو وہ آنبی ہی بولتے ہیں۔ بعض علاقوں میں الف مدہ کے بغیر انبی بھی بولتے ہیں۔ ہماری والدہ کی گفتگو میں فصاحت چاہے کم تھی لیکن بلاغت بے مثال تھی، اس بات کا ذکر یہاں میں نے اسلئے کیا ہے کہ زبان کی بنیاد اسی سے بنتی ہے، میرے ایک بزرگ دوست جو خاصے پڑھے لکھے اور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے اُن کو ہجے میں کبھی کبھی غلطی ہوجاتی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آپ کو ہجے (اسپیلنگ) میں چوک کبھی نہیں ہوتی! میں نے کہا یہ میری ماں اور ان سے زیادہ (خاص طور پر ہجے کے معاملے میں) میرے والد مرحومین کا اثر ہے۔ تشبیہات وتمثیلات میں مجھے والدہ کی زبان سے بہت فائدہ ہوا، وہ باتوں باتوں میں ایسی کہاوتیں اور مثالیں بول جاتی تھیں کہ زبان کا ذوق رکھنے والا آدمی عش عش کر اُٹھے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اور کب تک رہتیں؟ ہمی اب تک ہیں یہ اللہ کی دَین ہے ورنہ ہمارے ہی کتنے ہم عمر پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ وہ ہمارے درمیان نہیں رہیں لیکن گزرنے والا ہر دن ان کی عظمت کے احساس کو تیز کر رہا ہے، کوئی دن شاید ہی ایسا جاتا ہو، بلکہ نہیں، کوئی دن بھی ایسا نہیں جاتا جب میں رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيْراً کے حکم ربانی کی تعمیل نہ کرتا ہوں، اور کسی دن تو کئی کئی بار۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں (پارہ ۱۵ر سورت ۱۷ر آیت ۲۴ر میں) فرمایا ہے کہ میرے بندو! تم یہ دعاء کیا کرو کہ ''اے

میرے رب میرے ماں باپ پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔''

سچ کہا گیا ہے کہ ہر شے کی قدر اس کے چھن جانے کے بعد ہوتی ہے ماں باپ کا بھی یہی معاملہ ہے، میں اللہ کا شکر کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ماں باپ کی خدمت کی اور ان کو خوش رکھنے کی خوب توفیق دی وہ مجھ سے راضی تھے لیکن آج احساس ہوتا ہے کہ جتنی خدمت کی کم رہی۔

میرے والد صاحبؒ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ کبھی کبھی اپنی والدہ کے پاؤں دبایا کرو، ان کے سر کی مالش کیا کرو، عادت نہیں ہے اسلئے تمہیں جھجک ہوگی وہ بھی منع کریں گی لیکن یہ چیز تمہارے دین اور دنیا دونوں کے لئے بہت مفید ہوگی۔

چنانچہ میں نے یہ کرنا شروع کیا تو والدہ نے کہا کہ نہیں نہیں گدگدی ہوتی ہے۔ میں نے کہا رفتہ رفتہ یہ ختم ہو جائے گی میں نے اصرار کر کے پاؤں دبائے اور اکثر دبایا کرتا تھا، تیل کی مالش کرتا تھا، وہ کہتیں کہ بال اُلجھ جائیں گے! میں کہتا کہ کنگھے سے سلجھا دوں گا۔

میرے والد صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ بہت بہت جزائے خیر دے ماں کی دعائیں اور اندرونِ قلب کی دعائیں لینے کا نسخہ بتا گئے، اللہ تعالیٰ دونوں ہی کی مغفرت فرمائے اور رحم فرمائے۔ آمین۔

الف باء کا آغاز

مجھے بچپن کی وہ ساعتیں یاد ہیں جب میرے والد صاحب (مولانا محمد رحمت اللہ میرٹھی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وفات ۲۵/ جمادی الثانیہ سن ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۴/ جون ۱۹۷۶ء) نے مجھے چھوٹے سائز کا کارڈ بورڈ چڑھا ہوا نورانی قاعدہ دے کر اپنے مکان کی

بیٹھک میں چبوترے پر چٹائی بچھوا کر اپنے ایک شاگرد ملا جی احسان مرحوم (باشندۂ محل والا ضلع میرٹھ، یوپی) کے پاس پڑھنے کو بٹھایا تھا اور انھوں نے ورق پر میری ننھی سی انگلی پکڑ کر رکھی اور بولے: کہو الف، با، تا۔۔۔۔

آج ملا جی احسان نہیں ہیں لیکن ان کا احسان، ان کا دیا ہوا الف میرے ساتھ کھڑا ہے، انکی سکھائی ہوئی با میرا ساتھ دیتی ہے، انکی بخشی ہوئی تا عمر بھر سے میرے دل کی ترجمانی کر رہی ہے۔ کبھی کبھی وہ نہ آسکتے تھے تو انکے چھوٹے بھائی ملا جی غفران بھی پڑھاتے تھے اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے رحم فرمائے انکے بچوں کو خوشیاں دے۔ بعد میں وہ جب بھی ملے میرا احترام وہ استاد زادہ ہونے کی وجہ سے کرتے تھے اور میں انکا استاد ہونے کی وجہ سے۔

آگے کی تعلیم

اس کے بعد ہم جب دہلی آگئے تو محلہ کشن گنج (تیلی واڑہ) میں حاجی شفیع پیتل والوں کا مکان سکنڈ فلور کرائے پر لیا۔ وہاں رہائش تھی اور قریبی مسجد املی والی میں نماز کے لئے والد صاحبؒ کے ساتھ جانا ہوتا تھا، اس مسجد کے امام تھے الحاج مولانا حافظ صوفی عزیز الرحمن صاحب پانی پتی مرحوم (وفات ۶ / ربیع الثانی سن ۱۳۹۳ھ مطابق ۸ / مئی ۱۹۷۳ء) جنکی عملیات پر ایک مشہور کتاب آئینۂ عملیات ہے جو سن ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء میں مؤلف کے دوست مولانا مفتی سید حفیظ الدین احمد، مرحوم امام مسجد رنگریزاں صدر بازار، باڑہ ہندوراؤ دہلی کے تعارف کے ساتھ پہلی بار شائع ہوئی تھی۔

مسجد کے قریب ہی بازار میں دوکانوں کے اوپر فرسٹ فلور پر صوفی جی کا مدرسہ تھا، مجھے اور میرے چھوٹے بھائی حافظ محمد عبید اللہ مرحوم کو انکے پاس پڑھنے کے لئے بٹھا دیا

گیا۔ مسجد کے عقب میں شیش محل میں صوفی جی کی رہائش تھی۔ ان کے پاس ہم نے شاید دو چار ہی پارے پڑھے ہونگے کہ ہم بستی حضرت نظام الدینؒ منتقل ہو گئے۔

قرآن مجید ناظرہ وحفظ

یہاں تبلیغی مرکز کے مدرسہ کاشف العلوم میں داخلہ ہوا، اس دَور میں تبلیغی مرکز میں زیادہ تر عملہ میواتیوں پر مشتمل تھا وہی مدرس وہی طلبہ وہی زیادہ تر آنے جانے والے چنانچہ مدرسین میں اسوقت حافظ سلطان صاحب (گاؤں بیسرو، میوات) حاجی کریم بخش (میوات) حاجی حنیف (باجھوٹ، راجستھان میوات) اس کے کچھ بعد کے دور میں حافظ نورالدین (میوات) وغیرہ۔ یہ حضرات قرآن مجید کے مکتب حفظ وناظرہ کے اساتذہ تھے، یہاں قرآن مجید ناظرہ پورا کر کے حفظ شروع کیا، حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحب کے صاحبزادے مولوی ہارون مرحوم ہمارے حفظ کے ساتھی تھے۔ ۱۹/ پارے ہونے کے بعد والد صاحبؒ نے طے کیا اور اس فیصلے میں استاذ محترم حضرت مولانا قاری محمد سلیمان صاحب مالبی میواتی مرحوم کے مشورے کو بھی دخل تھا، میں مدرسہ تجوید القرآن میں چلا گیا۔

مدرسہ تجوید القرآن میں داخلہ

ہمارا داخلہ قاری محمد سلیمان صاحبؒ کے مدرسہ تجوید القرآن (آزاد مارکیٹ، پرانی دہلی) میں ہوگیا، یہ تعارف کراتا چلوں کہ اسوقت تک اس مدرسے کا تعارف فیاض گنج کے ساتھ ہوتا تھا جو متصل محلہ ہے، آزاد مارکیٹ اس وقت زیر تعمیر تھی، اور یہ مسجد تکیہ والی کہلاتی تھی۔

تکیہ کا مطلب آپ سرہانے رکھنے والا وِسادہ (کُشن) نہ سمجھ لیجئے، تکیے کا مطلب قبرستان، اس مسجد سے بالکل ملا ہوا قبرستان تھا اور اُسوقت وہاں ان گنت پکی قبریں تھیں،

یہ ہمارے بچپن کی بات ہے بیچ میں بھی جانا ہوتا رہا، اب ڈیڑھ دو سال قبل وہاں جو جانا ہوا تھا اس پورے حصے پر عمارتیں بن گئی ہیں اور آبادی ہوگئی ہے۔

قاری محمد سلیمان صاحب مالبیؒ

قاری محمد سلیمان صاحبؒ (بن کالے خاں) مالب ضلع گوڑگانواں میوات کے رہنے والے تھے (وفات سن ۲۰۰۲ء) قاری فتح محمد پانی پتیؒ کے شاگرد تھے اس وقت جوان تھے، تمام طلبہ کو وہ خود ہی پڑھاتے تھے، زندگی میں بہت سے حفاظ وقراء دیکھے، حفظ کے بہت سے کامیاب اساتذہ بھی دیکھے، حافظ نورالدین میواتی مدرس مدرسہ کاشف العلوم جن کا اوپر ذکر آیا حفظ کے کامیاب مدرس مانے جاتے تھے لیکن فنافی القرآن اور ہمہ وقت مشغول بالقرآن ہم نے قاری محمد سلیمان مالبیؒ کو ہی دیکھا۔ صبح شام، دن رات ہر وقت پڑھانا، سننا، نگرانی کرنا، بعد میں گنگوہ کے ایک اچھے استاذ قاری علیم الدین صاحبؒ مدرسہ تجویدالقرآن میں مدرس ہوکر آگئے تھے لیکن وہ شاید دو ایک سال ہی رہے تھے بعد میں انھوں نے بہادر گڑھ روڈ پر ایک اونچی مسجد میں حفظ کا مدرسہ قائم کیا مدرسہ علیمیہ جو آج بھی قائم ہے۔

سبعہ وعشرہ قرائتیں

قاری محمد سلیمان صاحبؒ صرف حفظ ہی نہیں کراتے تھے سبعہ اور عشرہ قرائتیں بھی پڑھاتے تھے، قرآن کے چند نسخوں پر انھوں نے سرخ قلم سے قرائت حفصؒ کے علاوہ دیگر قاری حضرات کی قرائتوں کے فرق لکھوا رکھے تھے، جو منتہی طلبہ ہوتے انکا الگ سبق ان مخصوص نسخہائے مصحف سے ہوتا تھا، اس کے علاوہ تنویر، شاطبیہ اور قراءت کی دیگر کتابیں

بھی پڑھاتے تھے اور جمال القرآن وغیرہ ابتدائی تجوید کی کتابیں تو حفظ کے تمام طلبہ کے لئے بھی لازم تھیں، یہ تمام کتابیں پڑھانا، پچاس ساٹھ لڑکوں کے اسباق سننا، آموختہ سننا، یہ یادرکھنا کہ کل کونسا پارہ سنایا تھا، آج کونسا سنایا جارہا ہے۔

اکثر اوقات چار چار پانچ پانچ لڑکے ایک ساتھ سنا رہے ہوتے اور ہر ایک پر پوری توجہ رہتی، جو غلطی کرتا فوراً ٹوکتے، مسجد کے وسیع صحن میں ٹہلتے ہوئے وہ سنتے اور طلبہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سناتے جاتے تھے، سبحان اللہ! عجیب منظر ہوتا تھا۔ جیسے مرغی کے پیارے پیارے چوزے ماں ساتھ ساتھ دوڑ رہے ہوں۔

مدرسہ کے لئے چندہ کرنا، مدرسے کے انتظامات دیکھنا، آنے والے مہمانوں کا خیال رکھنا یہ تمام کام وہ خود ہی کرتے تھے، مزاج ذرا سخت تھا، پٹائی بھی خوب کرتے تھے، ہمارے ساتھ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے رعایت تھی، اور یوں بھی کہ ہم اسوقت بہت کم سن تھے۔ لیکن زیادہ تر لڑکے چونکہ میواتی تھے اور کئی لڑکے بڑے سرکش بھی تھے ان کی پٹائی تو پولس کے انداز پر ہوتی تھی۔

ایک لفظ جو پہلی اور آخری بار وہیں سنا اور اس کی عملی شکل بھی صرف وہیں دیکھی وہ تھا ''گولا لاٹھی''، یعنی سخت مار لگانے اور سزا پانے والے کو بے بس کرنے کے لئے اس کو اس طرح عاجز کیا جاتا کہ دونوں ہاتھ گٹوں سے بندھوائے گئے پھر رانوں کو سینے سے لگا کر گھٹنوں کو کلائیوں کے اندر پھنسایا گیا اور ایک ڈنڈا گھٹنوں کے اندر ڈال کر سزا یافتہ کے دائیں بائیں نکال دیا گیا، اب وہ اسقدر بے بس اور مجبور ہو گیا کہ ہل جل بھی نہیں سکتا۔ یہ عمل ''گولا لاٹھی لگانا'' کہلاتا ہے۔ یہ کام دو تین لڑکے مل کر مکمل کرتے تھے اور پھر قاری صاحب خود اس کی پٹائی کرتے تھے۔ یہ پٹائی کبھی کئی کئی گھنٹے بھی چلتی تھی، مارتے مارتے تھک جاتے پھر سانس لے کر پھر ہوتی تھی۔

میں دل کی گہرائیوں سے دعاء کرتا ہوں کہ پروردگار! اگر اس عمل میں قاری صاحب مرحوم سے کبھی کچھ تعدّی ہوجاتی ہوتو ان کو اپنے کرم سے معاف فرمادے اوران کی خدمتِ قرآن مجید کے طفیل ان کو بخش دے۔آمین۔اور جو لڑکے اس طرح پٹے ہیں اگر ان میں سے کوئی ابھی باحیات ہوں اور میری یہ تحریر ان کی نظر سے گزرے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے قاری صاحب مرحوم کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعاء کریں، اس وقت کا پرانا غصہ اگر آج تک بھی ذہن کے کسی گوشے میں پڑارہ گیا ہوتو اسے تھوک دیں، بھول جائیں، انھوں نے آپ کو صرف مارا ہی تھوڑی تھا کچھ دیا بھی تو تھا! آپ اللہ کے لئے استاذ محترم کو معاف کردیں۔

ہم اور دو چار حیدر آبادی لڑکے تھے وہ تو اس منظر ہی کو دیکھ کر لرزتے تھے، ویسے یہ سزا عموماً دیگر طلبہ سے الگ لیجاکر قاری صاحبؒ کے حجرے میں ہوا کرتی تھی۔لیکن اس میں شک نہیں کہ قاری صاحب کے یہاں کے لڑکے قرآن مجید کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کے جوہری بن کر نکلتے تھے، سنانے والے کی باریک سے باریک غلطی اور ادائیگی میں چھوٹے سے چھوٹا فرق بھی ان کی پکڑ سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔مثال کے طور پر ایک حفظ کرنے والا بچہ اپنا سبق کسی عام حافظ کو سنا کر آیا اس نے کہدیا ٹھیک ہے، اسی بچے کا سبق اب قاری سلیمان صاحبؒ کے کسی شاگرد کو سنوایئے وہ کئی کئی جگہ اس کی غلطی نکالدے گا کہ یہاں تم یہ غلطی کررہے ہو اور یہاں یہ فرق ہورہا ہے، زبر زیر کی غلطی، ث، س، ص کا فرق ذال، زای، ظاء کا فرق تاء اور طاء کا فرق یہ زبان سے ظاہر ہونا ضروری ہے۔لیکن یاد رہے یہ وصف میں انہی حافظوں کا بیان کررہا ہوں جنہوں نے وہیں رہ کر حفظ کیا ہو، ان کے یہاں میوات اور دیگر مقامات کے پڑھے ہوئے حافظ لڑکے کچھ دن کو تصحیح کرانے کے لئے آجاتے تھے ان میں ہرگز یہ بات نہیں ہوتی تھی۔

ایک عجیب لقمہ

اللہ تعالیٰ خودستائی سے بچائے ہمارے پڑوس کی مسجد میں (حضرت نظام الدین اولیاؒ) میں ایک حافظ صاحب نے قرآن مجید سنایا جو بہت اچھے پرانے حافظ بھی تھے اور عالم بھی، تبلیغی مرکز کے مقیمین میں تھے "سن" یہ لگ بھگ سن ۱۹۶۸ء کی بات ہے، انھوں نے سورہ ہود (۱۱) کی آیت ٦٦ ویں آیت پڑھی وَمِنۡ خِزۡيِ يَومَئِذ، میں پہلی صف میں تھا انھوں نے "يَومَئِذ" میم کے زبر سے پڑھا، میں نے ٹوکا "يَومِئِذ" انھیں پکا میم کے زبر سے ہی یاد تھا وہ میرے لقمے کو نظر انداز کرتے ہوئے وہی پڑھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے، میں نے پھر ٹوکا، کئی بار جب ہوا تو مجبوراً وہ میرا لقمہ مان کر آگے بڑھے۔

سلام پھیرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے، میں نے کہا کہ قرآن مجید تو ابھی کھول کر دیکھ لیجئے گا لیکن آپ عربی گرامر سے بھی واقف ہیں یہاں خزی مضاف ہے اور یوم مضاف الیہ ہے، اس میم کو سوائے زیر کے آپ کچھ اور دے ہی نہیں سکتے، میں نے کہا اب قرآن مجید کھولئے، دیکھا تو يَومِئِذ ہی تھا۔

وہ بولے میں تو ۲۵ برس سے محراب سنا رہا ہوں اور بہت سے حافظوں نے بھی سنا ہے کسی نے نہیں ٹوکا، میں نے کہا یہ تو آپ جانیں۔

محترم ناظرین! یہ اللہ کا کرم اور میرے استاذ کا کرشمہ تھا، اس کا کریڈٹ میرے استاذ کو جاتا ہے اور یہی راز تھا کہ لوگ اپنی اولاد کو سخت مار لگنے کے باوجود قاری محمد سلیمان کے ہی مدرسے میں بھیجتے تھے۔ آج کا حال تو مجھے نہیں معلوم لیکن اس وقت کے معلوم ہندوستان میں میری معلومات کی حد تک حفظ وقرأت وتجوید کی ٹکسال قاری محمد سلیمان کا مدرسہ ہی تھا۔ کثّر اللہُ فینا أمثالَہ۔

ایک خاص اور عظیم نعمت یہ تھی کہ وہ پورا حافظ ہوجانے والے لڑکوں کو درسگاہ یعنی مسجد سے اور تمام لڑکوں سے الگ بٹھا کر ایک دوسرے وقت میں اپنے خاص کمرے میں پورا قرآن مجید سورہ فاتحہ سے لے کر والناس تک خود کہلواتے بھی تھے، میں نے بھی الحمد للہ یہ سعادت حاصل کی ہے۔

کوئی امام جچتا نہ تھا

جس طرح کوئی نہایت باریک بیں انجینئر کسی بلڈنگ کو دیکھ کر آسانی سے پاس نہیں کرے گا، ماہر خیاط (کپڑے کی کٹنگ اور سلائی کا ماہر ٹیلر) کسی سوٹ کو آسانی سے درست نہیں مانے گا، کوئی ماہر خاندانی باورچی (کک Cook) کسی کھانے کو چکھ کر منھ بناتا ہوا نفی میں گردن ہلادے گا، اسی طرح قاری صاحبؒ کسی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے اور اگر کبھی کہیں پھنس جائیں تو بعد میں الگ ایک طرف جا کر نماز دہراتے تھے۔ اور یہی حال وہاں کے پڑھے ہوئے حفاظ وقراء کا ہوتا تھا۔ خود ہمارا بھی شروع میں یہی حال تھا لیکن رفتہ رفتہ حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا، یا یوں کہیے کہ حالات سے مجبور ہو کر تھوڑا سا ''بے حس'' ہوجانا پڑا، اور اسی جذبے نے آگے چل کر بہت عرصے کے بعد ''امامت و خطابت اور اسکے تقاضے'' کتاب لکھنے پر آمادہ کیا۔ یا یوں کہیے کہ اس کتاب کے محرکات میں ایک بڑا محرک یہ بھی تھا۔ جس کا پہلا ایڈیشن قاضی پبلشرز، حضرت نظام الدین ؒ نئی دہلی سے سن ۲۰۰۲ء میں، اسکی دوسری اشاعت سن ۲۰۰۶ء میں اور پھر کچھ ترمیم واضافات کے بعد سن ۲۰۱۵ء میں تیسری اشاعت ہوئی اور اِس وقت اس کا چوتھا ایڈیشن زیرِ طبع ہے۔

اور اسی جذبے نے آگے چل کر ایک عرب عالم کی کتاب ''کیف تقرأ

القرآن'' کا ترجمہ ''آپ تلاوت کیسے کریں؟'' کے نام سے شائع کرانے پر مجبور کیا، میں نے اس کے تعارف میں لکھا تھا کہ

''سن ۱۹۹۰ء کی بات ہے دہلی کی ایک چھوٹی سی مسجد میں اتفاقاً گزرتے ہوئے عشاء کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، امام صاحب کی آواز ایسی سُریلی، دِل کش اور اس کا زیر و بم ایسا عمدہ تھا کہ فنِ قراءت سے ناآشنا شخص ان کو اعلی درجے کا قاری کہے بغیر نہ رہے گا، لیکن وہ انتہائی غلط پڑھ رہے تھے، میں نے سوچا کہ اگر مسجد کے متولی صاحب اور انتظامیہ کو توجہ دلائی جائے کہ ''وہ امام صاحب کو کچھ مشق کرنے کو کہیں'' تو وہ سب بے علم ہوں گے، وہ یہ مان ہی نہیں سکتے کہ ایسے عمدہ قاری صاحب بھی غلط پڑھ سکتے ہیں......''

یہ کتاب ۲۷۶ صفحات پر مشتمل پہلی بار سن ۱۴۲۲ھ-۲۰۰۱ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، اس کتاب پر استاذ محترم حضرت قاری محمد سلیمان صاحبؒ مالبی میواتی نے ایک سرسری نظر ڈالی تھی اور اس پر ان کی ۱۲رشعبان سن ۱۴۲۱ھ کی لکھی ہوئی تقریظ بھی ہے۔

مصنف کتاب شیخ ابو جہاد محمد ابوالفرج صادق صاحب نے کتاب چھپنے اور مطالعہ کرنے کے بعد ناشر کو جو مفصل خط لکھا تھا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''میری خوش نصیبی ہے کہ میری کتاب کو ایسا مترجم ملا ہے'' اسلئے کہ میں نے مضمون کی تکمیل کے لئے قوسین میں بہت سے اضافے بھی کئے تھے، ان کی بعض فروگزاشتوں کو درست کیا تھا، انھوں نے جو چند حدیثیں لکھی تھیں ان کی تخریج کی تھی وغیرہ۔

اردو کی تعلیم

ہماری تعلیم حفظ وقراءت کے بعد جس درسگاہ میں شروع ہوئی مدرسہ کاشف العلوم (بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ) وہاں اردو تعلیم کا کوئی اہتمام نہ تھا اور ٹھیک بھی تو ہے، مچھلی کے بچوں کو کون تیرنا سکھاتا ہے، لیکن یہ درست نہیں اردو مادری زبان والوں کو بھی اردو پڑھنا ضروری ہے، گھریلو اور روزمرہ کی سادہ زبان اور چیز ہے اور کتابی زبان، ادبی زبان، اخباری زبان اور فصیح زبان ہمیشہ علاحدہ اور ہر ملک وقوم میں الگ ہی ہوتی ہے جس کا سیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ تاہم مولوی اسماعیل میرٹھی مرحوم کی اردو کی پہلی دوسری ایک دو کتابیں پڑھانے کے ساتھ ساتھ مولانا عبداللہ گنگوہیؒ (م ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء) کی تیسیر المبتدی جو فارسی زبان سیکھنے کی ابتدائی عمدہ کتاب ہے اور مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوریؒ (رام پور منہیاران ضلع سہارنپور، م ۱۳۳۷ھ۔۱۹۱۸ء) کی حمد باری شروع کرادی گئیں، یہ دونوں کتابیں حفظ یاد کرائی جاتی تھیں، آج بھی حسب موقع حمد باری کے اشعار کسی لفظ پر بے اختیار یاد آجاتے ہیں اور مراجعت لغت کی حاجت نہیں رہتی۔

فارسی کی تعلیم

صدیوں ہندوستان میں علمی، ادبی، کتابی اور سرکاری زبان فارسی رہی ہے اس وقت تو اس کا سیکھنا بہت ضروری تھا ہی لیکن اب جبکہ وہ صورت حال نہیں ہے اب بھی ذہن کی جلا کے لئے، قدیم فارسی کتب سے استفادے کے لئے اور خود اعلیٰ اردو زبان کے فہم کے لئے فارسی پڑھنا ضروری ہے۔ اردو شعر کا پورا لطف وہ شخص نہیں اٹھا سکتا جو فارسی سے نا آشنا ہے۔

ہمارے مدارس میں اب تو خیر فارسی پر توجہ اور بھی کم ہوگئی ہے جو اچھی علامت نہیں ہے، لیکن ہمارے دور طالب علمی میں تیسر المبتدی کے بعد گلزار دبستاں، گلستاں

بوستاں، اخلاق محسنی، فارسی کی پہلی، دوسری بھی پڑھائی جاتی تھیں، پندنامہ، کریما، بدائع منظوم، نام حق (ایک چھوٹی سی کتاب فارسی میں فقہی مسائل پر ہے) اسی طرح مالا بدمنہ بھی فارسی زبان میں ضروری مسائل پر عمدہ کتاب ہے۔ مؤلفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اور ہم سے پہلے دور میں تو اخلاق جلالی شاہ نامہ فردوسی اور دیگر کئی کتابیں بھی داخل درس تھیں۔

مولانا نور محمد صاحب میواتیؒ

یہ اردو اور فارسی کی مذکورہ اکثر کتابیں ہمیں مولانا نور محمد صاحب اُٹاوڑی میواتیؒ (م ۲۰۰۵ء) نے پڑھائیں جو مدرسہ کاشف العلوم کے اوسط درجے کے مدرس تھے۔

عربی تعلیم

اس کے بعد نحو میر، صرف میر، کافیہ، شرح ملا جامی، شرح وقایہ وغیرہ بھی انہی کے پاس ہوئیں۔

مولانا محمد یعقوب خان صاحب سہارنپوریؒ

البتہ ہدایۃ النحو مولانا محمد یعقوب خاں صاحب سہارنپوری کے پاس ہوئی جو اس وقت جوان بلکہ نوجوان تھے اور مدرسہ کے مستقل مدرس نہ تھے بلکہ صرف پڑھانے کے لئے ایک دو گھنٹے کے لئے آتے تھے اور دلی کالج میں کچھ انگریزی کے امتحان وغیرہ کی تیاری میں تھے، بعد میں وہ مدرسہ کے مستقل مدرس ہو گئے تھے اور تبلیغی مرکز کے مستقل مقیمین میں شامل ہو گئے تھے۔ لمبی عمر پا کر ابھی سن ۲۰۱۹ء میں انتقال ہوا ہے۔

ان کے نام کا لطیفہ بھی پڑھتے چلئے، ان کا اصل نام ''یاقوت'' تھا جو ایک قیمتی پتھر

کا نام ہے، لیکن یہ نام بحیثیت انسانی نام کے نامانوس اور غیر معروف ہے اسلئے سننے والے یاقوت سنکر بھی یعقوب ہی سمجھتے اور یعقوب ہی بولتے تھے، مولانا بتاتے تھے کہ میرا نام یہ نہیں یہ ہے مگر آخر کب تک؟ تھک ہار کر انھوں نے آخر میں ہتھیار ڈال دیے اور مان لیا کہ ان کا نام یعقوب ہی ہے۔ اور پھر وہ خود بھی یہی لکھنے بولنے لگے تھے۔آدمی بڑے قاعدے سلیقے کے تھے، طلبہ کی اخلاقی تربیت بھی کرتے، کبھی کوئی طالب علم چپکے سے سلام کئے بغیر آجاتا تو اسے واپس باہر بھیجتے کہ وہ دوبارہ سلام کر کے اجازت لے کر آئے۔ انھوں نے مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ کی حیات الصحابہ کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ وہ ترجمہ نہ شروع کتاب سے تھا نہ اخیر سے بلکہ درمیان کے کچھ حصے کا تھا، اس کی ایک جلد چھپ بھی گئی تھی اور اس کی بھی ایک کہانی ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ ساری کہانیاں کہاں تک سنائی جائیں۔ سننے والے بھی تھک جائیں گے۔ داستانِ حیات کا کوئی اخیر نہیں ہوتا۔

مولانا صدیق صاحب میواتیؒ

اس مدرسے کے صدر مدرس مولانا محمد صدیق صاحبؒ تھے (م ۲۰۰۷ء) وہ بھی اُٹاوڑ گاؤں میوات ہریانہ کے رہنے والے تھے، بہت متواضع منکسر المزاج مدرسہ میں جھاڑو لگانے کبھی وضو خانے کی اور حوض کی نالیاں صاف کرنے اور ایسے کسی کام میں ان کو تکلف نہ تھا، انہیں لگا ہوا دیکھتے تو طلبہ بھی ساتھ لگ جاتے تھے، ان کے پاس ہماری حُسامی وغیرہ ہوئیں۔ عرصۂ دراز کے بعد قصبہ نوح (میوات) میں انھوں نے مدرسہ قائم کیا ''عین العلوم'' آج بھی یہ مدرسہ قائم ہے میوات میں انکے شاگرد پورے میوات میں بڑی تعداد میں ہیں، انکی بڑی عزت تھی۔ میرے اوپر اخیر تک بہت مشفق ومہربان رہے۔ ادارہ امور مساجد کے کاموں میں بہت معاون رہے۔ مدرسہ کاشف العلوم کی لائبریری (جو کتب خانہ کہلاتا

تھا) بھی انہی کی نگرانی میں تھا، مطالعے کے بے حد شوقین تھے۔ چنانچہ مدرسہ عین العلوم میں ان کا کوئی اور کمرہ نہ تھا مدرسہ کی لائبریری ہی ان کا کمرہ تھا۔ ہمیشہ اسی میں ملتے تھے۔

طلبہ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون فرماتے تھے، ایک بہاری طالب علم امانت حسین گیاوی کو یہاں سے جانے کے بعد بہار کے مدرسہ بورڈ کے ایک مدرسے میں ملازمت مل رہی تھی لیکن مدرسہ کاشف العلوم سے فارغ التحصیل ہونے والوں کو سند نہیں دی جاتی تھی وہ غریب یہاں آیا اور مولانا سے اپنی ضرورت بتائی، مولانا نے (بے ضابطہ یا باضابطہ) اس کو رنگین بیل بوٹے والے آرٹ پیپر پر سند کی کتابت کرا کے دستخط کر کے اور کروا کے دے دی اور اسے وہاں معقول ملازمت مل گئی تھی۔

مجھے ان کی صحبت سے کتابوں کے مطالعے اور درسی وغیرہ درسی کتابوں سے دلچسپی پیدا کرنے میں بہت مدد ملی علیہ الرحمۃ والرضوان۔

مولانا محمد عمر خاں بستویؒ

مدرسہ کے ایک استاد مولانا محمد عمر خاں بستویؒ تھے، حافظہ ان کا غضب کا تھا ڈکشنری دیکھتے ہوئے اتفاق سے جس لفظ پر نظر پڑ گئی وہ بھی انہیں یاد رہ جاتا تھا، صُراح (لغت) جو اصلاً صِحاح جوہری کا فارسی ترجمہ ہے جیسے مصباح اللغات منجد کا اردو ترجمہ ہے، صراح ان کے پاس تھی اس کا مطالعہ باہتمام کرتے تھے، صراح کے مصنف ابوالفضل محمد بن عمر القرشی جمالی ہیں اس کتاب کی تصنیف سے وہ سن ۶۸۱ھ میں فارغ ہوئے۔

مصباح اللغات اور القاموس الوحید کا ذکر

اسوقت تک میدان میں عربی اردو لغت کوئی معتد بہ نہ تھا تقریباً انہی ایام میں کچھ

پہلے سن ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں مولانا عبدالحفیظ بلیاوی (وفات ۱۷ر جمادی الاخریٰ سن ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۰ر اگست سن ۱۹۷۱ء) کی کتاب مصباح اللغات بازار میں آئی اور خالی میدان ملا بہت جلد مقبول ہوگئی ع

فَصَادَفَ قلباً فارغًا فتمكَّنا

مصباح اللغات نصف صدی سے زیادہ تک تمام علماء طلبہ ومدارس کی توجہ کا برابر مرکز بنی رہی تا آنکہ اس میدان میں بڑی آن بان سے سن ۲۰۰۷ء میں القاموس الوحید نے آکر قدم رکھدیا اور اس ضرورت کو بہت بہتر طور پر پورا کردیا، لیکن اُسوقت اساتذہ زیادہ تر قاموس اور صحاح وصراح دیکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، اردو لغت یا کتابوں کے اردو تراجم وشروح پسند نہیں کرتے تھے، ان کے مطالعے کو استعداد کی کمزوری کا سبب مانا جاتا تھا۔

مولانا محمد عمر خاں صاحب بستویؒ کے پاس ہماری قطبی، میر قطبی، مقامات حریری، دیوان متنبی، دیوان حضرت حسانؓ بن ثابت ہوئیں۔

یہ مولانا ہمارے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک دوست بھی تھے، ان کی بہت خاص بات یہ تھی کہ یہ عربی لفظ کی اصل روح کو پہچانتے تھے اور اسکی وضاحت کرتے تھے، یہ بات ہم نے کسی اور استاد میں نہیں دیکھی، میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اس مزاج کا کسی قدر اثر ۔بتوفیق الٰہی ۔ میں نے قبول کیا، چنانچہ اس مزاج کے تحت میں نے جو کتب لغت دیکھیں تو مجھے سب سے زیادہ پسند آئیں دو کتابیں، قدیم کتب میں تو ''المفردات'' جسکو ''مفردات ألفاظ القرآن'' بھی کہا جاتا ہے جو ابوالقاسم حسین بن محمد بن المفضل المعروف بالراغب الاصفہانی (م ۵۰۲ھ ۱۱۰۸ء) کی تالیف ہے۔

اور دوسرا لغت دور حاضر کا المعجم الوسیط ہے جو لفظ کی روح اور اس کی

حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسے اسکی جامع و مانع تعریف کر رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر لفظ ایک الگ معنی کے لئے وضع ہوا ہوتا ہے، پوری طرح کوئی لفظ دوسرے لفظ کا مرادف نہیں ہوتا جَلَسَ اور قَعَدَ بظاہر مرادف ہیں قَامَ، وقَفَ اور نَهَضَ بظاہر مرادف ہیں لیکن باریکی سے دیکھئے تو ہر ایک کے مفہوم میں دوسرے سے کوئی فرق ضرور ہے۔ بِئر، طَوِیَ، قَلیب غَرْب اور حُفرۃ سب کے معنی کنویں یا گڈھے کے آتے ہیں لیکن ہر ایک کے مفہوم میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے ان باریکیوں کو سمجھنا ایک عربی داں بلکہ زبان کے ہر عالم کے لئے ضروری ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہمیں ان سے ان باریکیوں کو سمجھنے کا بہت تفصیل سے تو موقع نہیں ملا۔ عمر بھی اس وقت بہت کم تھی لیکن ان سے یہ ذوق حاصل ہوا، مولانا محمد عمر خاں بستوی کا غالبا سن ۱۶-۲۰۱۷ء میں ان کے وطن ہی میں انتقال ہوا۔ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ ان کی بہت رعایت اور قدر کرتے تھے، وہ جو طحاوی شریف کی شرح أماني الأحبار لکھ رہے تھے اس میں مدد کے لئے انھوں نے مصر سے علامہ بدرالدین عینی کی لکھی ہوئی شرح طحاوی کے قلمی نسخے کی عکسی نقل منگوائی تھی، اس کا خط شکستہ اور بہت باریک تھا، اس کو ہر کوئی پڑھ نہیں پاتا تھا، مولانا محمد عمر خاں صاحب بستوی اس کو بسہولت پڑھ لیتے تھے اور خط ان کا اچھا تھا وہ اس کو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے لئے نقل بھی کرتے تھے۔ جہاں شرح میں حضرت مولاناؒ چل رہے ہوتے تھے اس سے کچھ آگے کی یہ نقل تیار کرتے رہتے تھے، جمعیۃ علماء ہند کی کوشش سے عینی کی یہ شرح اب الحمدللہ چھپ گئی ہے۔

میں چونکہ اسوقت تعلیم سے فارغ ہو کر حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے ہمراہ ان کے دارالتالیف میں بیٹھ کر ان کا معاون ہوا کرتا تھا اسلئے اس نقل سے میرا بھی رابطہ رہتا تھا اور وہ مجھے بھیج کر مولانا محمد عمر صاحب سے اس کے یہ نقل شدہ صفحات منگواتے تھے۔

مجھے بھی اس تحریر کو پڑھنے کی اچھی خاصی مشق ہوگئی تھی۔ یہ بات سن ۶۵-تا-۱۹۶۲ء کی ہے۔ افسوس یہ شرح مکمل نہیں ہوسکی تھی۔ لیکن جتنی بھی لکھی گئی تھی وہ پوری چھپ چکی ہے۔

فتحپوری مسلم سینئر سکنڈری اسکول (دہلی) کی لائبریری

میں نے نہ مدرسہ عالیہ فتحپوری میں پڑھا نہ وہاں کے اس وقت کے اساتذہ سے کوئی خاص تعلق رہا، لیکن کسی طرح وہاں کی جامع اور قیمتی لائبریری سے میرا تعلق ہوگیا تھا اور اس وقت غالباً پچاس روپے زرضمانت جمع کر کے لائبریری کا ممبر بنا جاسکتا تھا، میں اس کا ممبر بن گیا تھا اور اللہ جزائے خیر عطا فرمائے وہاں کے لائبریرین محترم مولانا روشن علی صاحب قاسمی مرحوم (وفات سن ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۰۱۳ء) کو وہ مجھے میرا شوق دیکھتے ہوئے اعتماد پر ایسی کتابیں بھی جاری کر دیتے تھے جو عام طور پر جاری نہیں کی جاتیں، وہیں سے میں نے مطوّل، اور مختصر المعانی کی شروح، فتح القدیر لابن الہمام اور شروح اربعہ اور نہ جانے کون کونسی کتابیں نکلوائیں، مجھے وہ وقت تو زیادہ دیدیا کرتے تھے لیکن میں بھی دیے ہوئے وقت پر لازماً کتاب واپس کردیا کرتا تھا، وہ لائبریری بڑی عمدہ تھی آج افسوس کہ اس کا پرسان حال کوئی نہیں اور خدا جانے وہ کس حال میں ہے، وہ ایک بڑے اسلامی مدرسے کے شایان شان لائبریری تھی، مولانا روشن علی صاحب مرحوم اپنی دل چسپی اور لگن سے اسے چلا رہے تھے، اس میں اخبارات ورسائل دیکھنے والے تو بہت آتے تھے لیکن عربی کی قدیم کتابوں کے جویا تو میرے جیسے دو ایک ہی دیوانے آتے ہونگے اور اسی لئے شاید روشن علی صاحب مرحوم مجھے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غالباً ان کا جذبہ یہ تھا کہ ان قدیم کتابوں کو نہ مدرسے کے اساتذہ نکلواتے ہیں نہ طلبہ۔ اس لئے جو بھی کوئی ان کا طلبگار آ رہا ہے اسی کو فائدہ اٹھانے دیا جائے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے اندر قدیم کتابوں اور اکابر کی شروح وحواشی اور مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اس لائبریری کا بھی حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس لائبریری کی حیات نو کا غیب سے سامان فرمائے آمین۔

مولانا منیرالدین صاحب میواتیؒ

مدرسہ کاشف العلوم بستی حضرت نظام الدینؒ کے ایک بزرگ استاذ مولانا منیرالدین میواتیؒ بھی تھے جو عموماً مولوی منیرا کے نام سے مشہور تھے، انکے یہاں ہماری مختصر المعانی تلخیص المفتاح، شرح عقائد نسفی اور قصیدہ بردہ کے اسباق تھے، ہمارے رفقاء درس میں خاص طور پر ان کے یہاں مولوی طلحہ مرحوم (وفات سن ۲۰۱۹ء ابن مولانا محمد زکریا صاحبؒ شیخ الحدیث) بھی تھے، نظر تو مولانا منیرالدین صاحبؒ کی بہت کمزور ہوگئی تھی لیکن پرانے مدرس تھے کہا جاتا تھا کہ وہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور مولانا انعام الحسن صاحبؒ کے بھی استاد رہے تھے، لیکن نظر کی کمزوری کی وجہ سے ان کو پڑھانے میں کوئی دقت نہ تھی، وفات ۱۹۷۲ء۔

مولانا حبیب اللہ صاحب پالن پوریؒ

ایک خاموش طبع، سنجیدہ وباوقار عالم فاضل استاذ مدرسہ کاشف العلوم میں مولانا حبیب اللہ صاحب پالن پوری گجراتیؒ بھی تھے، اقبال کے رنگ میں اشعار بھی کہتے تھے، ان کی ایک کتاب مطبوعہ ہم نے دیکھی تھی ''صور اسرافیل'' اور یاد پڑتا ہے کہ یہ کتاب مولانا نے مجھے عنایت فرمائی تھی لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے وہ زیادہ عرصے یہاں نہیں رہے تھے، پان کھاتے تھے، کبھی کبھی مرکز تبلیغ مین ان کی تقریر بھی ہوتی تھی، ہماری ان کے پاس کنزالدقائق ہوئی تھی، کتنی ہوئی

تھی یاد نہیں، لیکن اس ناچیز پر شفقت فرماتے تھے، وفات ۴؍جنوری ۲۰۰۳ء۔

مولانا معین الدین صاحب بلند شہریؒ

نوجوان اساتذہ میں وہاں مولانا معین الدین صاحبؒ بھی تھے، یہ منشی انیس احمد صاحبؒ (ادارہ اشاعت دینیات) کے بھتیجے تھے، مولانا محمد عمر خاں صاحبؒ اور یہ مدرسہ کاشف العلوم میں ہم سبق رہے تھے بعد میں یہاں مدرس ہو گئے تھے، مولانا معین الدین صاحب کے سپرد مرکز تبلیغ میں دسترخوان کا انتظام بھی تھا، ان کے پاس ہماری بدائع منظوم، گلزار دبستان، نام حق اور کئی کتابیں ہوئی تھیں، وفات ۱۱؍مئی سن ۲۰۰۱ء۔

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ

مدرسہ کاشف العلوم کے مدرسین میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور مولانا انعام الحسن صاحبؒ بھی تھے لیکن ان کا ذکر میں اپنے اساتذہ میں اسلئے نہیں کر رہا ہوں کہ وہ منتہی طلبہ کو یعنی دورے کے طلبہ کو پڑھاتے تھے، میں شرح وقایہ اور مختصر المعانی کے بعد ہی مظاہر علوم چلا گیا تھا۔

لیکن مولانا محمد یوسف صاحبؒ ایک اور طرح میرے علمی محسن ہیں، میں سن ۱۹۶۲ء کے بعد جب مظاہر علوم سہارنپور سے گھر آ گیا تھا ان ایام میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے مجھے اپنے ساتھ امانی الاحبار شرح معانی الآثار (شرح طحاوی شریف) کے کام میں لگا لیا تھا جس کا ذکر چند صفحے قبل آ چکا ہے۔ اس کا کچھ ذکر مطبوعہ کتاب ''مظاہر علوم میں دور طالب علمی۔۔۔۔'' میں بھی آ چکا ہے۔

کتابوں کی شُد بُد

دور طالب علمی میں سوائے درسیات کے دیگر کتب سے واسطہ نہیں ہوتا اور ہونا بھی نہیں چاہئے، چنانچہ اب جو میں نے ان کے دارالتالیف میں بیٹھنا شروع کیا تو ایک الگ ہی دنیائے کتب سے آشنائی ہوئی۔ وہ ایک اچھی اور منتخب لائبریری تھی، اس میں تمام تر کتابیں عربی کی تھیں اور زیادہ تر اسلامی تاریخ، سیرت وطبقات حدیث وعلوم حدیث پر تھیں۔

ان کا دارالتالیف مسجد بنگلے والی خاص مسجد کے شمالی کمرے کی دوچھتی پر تھا، وہ بہت یکسوئی کی جگہ تھی۔

حضرت مولانا (حضرت جیؒ) مجھ سے جو کام لیتے تھے وہ تو یہ تھا کہ وہ امانی الاحبار میں جہاں چل رہے ہوتے اس سے آگے آنے والے عنوانات وموضوعات وہ ایک کاپی میں لکھدیتے، میرا کام یہ تھا کہ مختلف بتائی ہوئی کتابوں میں ان پر بحث کہاں کہاں کن صفحات پر ہے میں تلاش کرکے ان کتابوں کے نام اور جلد وصفحے لکھتا جاؤں تاکہ جب کام کرتے ہوئے وہ وہاں پہنچیں تو انکو مضامین نکالنے میں آسانی ہو۔

ان کے اس کام کے علاوہ مجھے اور بھی بہت وقت ملتا تھا، وہ تو دن میں دو ایک گھنٹے تصنیفی کام کرکے اپنے دعوتی تبلیغی مشاغل کے لئے نیچے مسجد میں اور مہمانوں سے ملاقات کے لئے چلے جاتے، پھر میں اس دریائے علم ودانش اور خزانۂ کتب میں مصروف ہوجاتا تھا، کتابوں کا تعارف میں حسب ضرورت حضرت جیؒ سے بھی حاصل کرتا تھا اور خود دیکھتا سمجھتا بھی رہتا تھا، مسند احمد کا چھ جلدوں والا قدیم مصری نسخہ (مطبوعہ ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء) جو بہت باریک خط میں مظاہر علوم میں دیکھا تھا جسکے حاشیے پر منتخب کنزالعمال بھی چھپی ہوئی ہے۔ یہاں احمد محمد شاکرؒ کی تحقیق وتعلیق والا نیا ایڈیشن بھی دیکھا جس پر اسوقت کام چل رہا تھا اور چند جلدیں ہی شائع ہوئی تھیں۔ اپنے ملک کے مایۂ ناز محدث استاذ محترم

حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمیؒ صاحب کا پہلی بار اسی کتاب کی اخیر جلدوں میں احمد محمد شاکرؒ کے اعتراف سے اندازہ اور تعارف ہوا۔

تفسیر ابن جریر کا نام سنا تھا یہاں وہ تفسیر کا سمندر آنکھوں سے دیکھا، ہاتھوں میں لیا اور دل کو شاد کیا اور بھی بہت سی کتب تفسیر وحدیث وفقہ کی دیکھیں۔ البدایہ والنہایہ بھی پہلی بار یہیں دیکھی، امام نور الدین علی بن ابی بکر الھیثمیؒ (م ۸۰۷ھ) کی مجمع الزوائد پہلی بار یہیں دیکھی جو اپنی قسم کی منفرد جامع اور بے مثال کتاب ہے اور اس کی ترتیب بھی بہت عمدہ ہے۔

فہرست ابن ندیم پہلی بار یہیں دیکھی حیرت ہوئی کیسی اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے، یہ کشف الظنون والا موضوع ہے، مگر بہت قدیم کتاب ہے۔ سچ پوچھئے تو دنیائے علم کی جتنی سیر کیجئے اپنی بے علمی بے بضاعتی اور اپنی بے خبری کا اندازہ ہوتا ہے، یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے اپنی زندگیاں فنا کر کے کیسے کیسے کام کر کے بعد والوں کے لئے چھوڑے ہیں اللہ تعالیٰ انکو جزائے خیر عطا فرمائے، اور ہمیں ان سے استفادے کی توفیق بخشے۔ آمین

علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی الجامع الصغیر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذخیرۂ کتب میں تھی لیکن اس کی جامع ومبسوط اور انتہائی مفید شرح فیض القدیر (چھ جلدیں) پہلی بار یہیں دیکھی، میں اس کا ایسا گرویدہ اور عقیدت مند ہوا کہ بعد میں میں نے وہ ایک حاجی صاحب کے ذریعے مکہ مکرمہ سے منگوائی اور وہ آج بھی میرے ہر وقت کے استعمال میں رہتی ہے اور اس پر میں نے یہاں کے حوالے وہاں اور وہاں کے یہاں جگہ جگہ لکھ رکھے ہیں اور اس کی جلدوں کے شروع والے صفحات پر اس کے بہت سے افادات کے حوالے لکھ کر بھر رکھے ہیں۔

اس کے مصنف ہیں علامہ عبدالرؤف المناویؒ (المتوفی ۱۰۳۱ھ-۱۶۲۲ء)

میرے پاس اس کا نسخۂ طبعۂ ثانیہ ہے جو سن ۱۳۹۱ھ-۱۹۷۲ء میں چھپا ہے اس کی پہلی طباعت ۱۳۵۷ھ میں مکمل ہوئی تھی یہ اسی کا ری پرنٹ ہے۔اب اسی کا عکس لے کر تیسری بار بھی چھپ چکی ہے۔

علامہ مناویؒ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ اعلیٰ درجے کے محدث بھی ہیں سیوطیؒ کے اوہام پر تنبیہ بھی کرتے ہیں، احادیث کی شرح بہت عمدہ کرتے ہیں، اگر ہم معنی یا قریب المعنیٰ حدیث ایک سے زیادہ مقامات پر آئی ہے تو ہر جگہ الگ قسم کی شرح اور نئے فوائد پر مشتمل مضامین بیان کرتے ہیں۔صوفیاء کرام کے نکات اور نادر معلومات فراہم کرتے ہیں، تصوف وسلوک کی روشنی سے پوری کتاب منور ہے۔مفید اشعار بھی جگہ جگہ لکھتے ہیں۔ حضرت جیؒ کی رفاقت سے اور بھی بہت کچھ ملا جزاہ اللہ خیرا۔

مدرسہ ہذا کے بنگالی طلبہ

مدرسہ کاشف العلوم میں جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں سب سے زیادہ طلبہ اس وقت میوات کے ہوا کرتے تھے اس کے بعد بنگالی طلبہ ہوتے تھے، ان میں اپنی زبان و تہذیب کے حوالے سے آپس میں زبانی جنگ بھی چلا کرتی تھی۔

خریداری کتب

لیکن پڑھنے میں اور کتابیں خریدنے میں زیادہ دل چسپی بنگالی لڑکوں میں پائی جاتی تھی، بہت زیادہ تو نہیں لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی حد تک ان بنگالی طلبہ سے مجھے بھی کتابیں خریدنے کا شوق پیدا ہوا۔

اور کوئی بیٹا اپنی ماں کو کس کس موقع پر فراموش کر سکتا ہے میری والدہ مجھے کتابیں

خریدنے کے لئے پیسے دینے میں خاصی فراخ دلی سے کام لیتی تھیں۔ والد صاحب مرحوم کی جو خود اپنی کتابیں تھیں وہ عموماً درسیات نہ تھیں، لیکن وہ خود بھی میرے لئے بہت سی کتابیں فراہم کرتے تھے، اپنے حج کے سفروں میں انھوں نے میرے لئے بہت سی کتابیں خریدیں، جلالین پڑھنے کے زمانے میں صاوی، ابوالبقاء کی املاء ما منّ بہ الرحمن فی اعراب القرآن، تفسیر ابن عباس (تنویر المقیاس) مناہل العرفان، الاتقان فی علوم القرآن، البرہان فی علوم القرآن، القِریٰ لقاصد ام القُریٰ للمحب الطبری، ریاض الصالحین، نیل الاوطار اور بہت سی کتابیں اپنے سفروں میں وہ میرے لئے لاتے تھے اور میرے مطالعۂ کتب کے شوق سے بہت خوش ہوتے تھے اللہ تعالیٰ میرے والدین کو بے حد و بے حساب جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

دوسرا باب

مظاہر علوم میں داخلہ

یہ سن ۱۳۸۰ھ-۱۹۶۰ء تک کے حالات ہیں اس کے بعد میری تعلیمی زندگی میں ایک بڑا انقلاب آیا، جو چوزہ اب تک کبھی اپنی ماں کے پروں کی چھتر سایہ سے ایک دن کے لئے بھی باہر نہ نکلا تھا اب وہ مہینوں کے لئے دور بہت دور دوسرے صوبے میں یعنی دہلی سے یوپی میں جا رہا تھا، اس تھوڑی سی عمر اور چھوٹے سے دماغ میں اور کوئی بڑی بات تو نہیں تھی بس شوق یہ تھا کہ کسی بڑے مدرسے میں جا کر پڑھنا چاہئے۔ میں نے ''دور بہت دور'' اس وقت اور اس عمر کے لحاظ سے کہا ہے ورنہ دہلی اور سہارنپور کا فاصلہ بہت دور نہیں کہلائے گا۔

وہ بڑا مدرسہ کونسا ہو؟ والد صاحبؒ حالانکہ خود دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور میں بھی وہیں جانا چاہتا تھا لیکن والد صاحب نے میرے لئے مظاہر علوم کو پسند کیا۔ چنانچہ سن ۱۳۸۰ھ کے شوال (۱۹۶۰ء) میں مدرسہ مظاہر علوم میں داخلہ ہو گیا۔

میری تعلیمی زندگی کے تین ادوار میں سے دوسرا دور مظاہر علوم کا یہ دَور ہے، پھر مظاہر علوم کے بھی میرے دو دور ہیں، پہلا تو مذکورہ تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور بیچ میں تھوڑا سا وقفہ سن ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک کا آتا ہے۔ پھر ۱۹۶۵ء کے درمیان سے جون ۱۹۶۶ء تک سہارنپور کا دوسرا دور ہے جبکہ میں سہارنپور حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی دعوت پر ان کے تصنیفی کاموں میں معاون ہو کر گیا اور پھر میرا تدریس کا دور شروع ہوا، جبکہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے رخصت ہو کر گھر (حضرت نظام الدینؒ) آیا اور وہاں سے مظاہر العلوم سیلم (تمل ناڈو) چلا گیا تھا۔ سن ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء سے یہاں تک کے یعنی تعلیمی زندگی کے دوسرے دَور کے حالات محترم مولانا محمد سعیدی صاحب حفظہ اللہ ناظم مدرسہ مظاہر علوم (وقف) کی تحریک پر میں نے مظاہر علوم کے ترجمان ماہانہ رسالہ آئینۂ مظاہر علوم میں قسط وار لکھے ہیں اور ان تمام قسطوں کو جمع کر کے انھوں نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے یہ کتاب بنام ''مظاہر علوم میں دور طالب علمی کی یادیں'' سن ۱۴۳۹ھ-2018ء میں سہارنپور سے چھپ چکی ہے صفحات ۱۳۶۔

اگر میرے علمی سفر کے تین حصے یا تین باب کئے جائیں تو پہلا تو وہ ہے جو شروع سے سن ۱۹۶۰ء تک ہے جبکہ میرا داخلہ مظاہر علوم میں ہوا۔

دوسرا اسکے بعد سے ہے جسکی روداد مذکورہ کتاب میں آگئی ہے۔

تیسرا حصہ یا تیسرا باب آگے زمانۂ تدریس سے شروع ہوتا ہے اور جاری ہے۔ گویا دوسرا حصہ پہلے شائع ہو چکا ہے اور پہلا اور تیسرا اس وقت قلم بند ہو رہا ہے۔

اس بے ترتیبی پر مجھے آں جہانی منشی مہتاب رائے کا شعر یاد آ گیا جو کبھی حضرت والد صاحبؒ سے سنا تھا ؎

''ہم'' اُلٹے ''بات'' اُلٹی ''یار'' الٹا
نہ ہو پھر کیوں ہمارا کار اُلٹا

اس شعر میں نکتہ یہ ہے کہ شاعر نے اپنے نام کے تین حصے کر کے ہر ایک کو اُلٹ دیا ہے ''مہ'' - ''تاب'' - ''رائے''۔

یاری دوستی

ناظرین: مین اپنے اس مزاج کو کیا نام دوں؟ سمجھ میں نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا کبھی کوئی گہرا دوست نہیں ہوا، جس کے ساتھ گھومنا پھرنا ہو، دیر تک گپ شپ ہو، ہمارے استاد حضرت شیخ زکریاؒ بھی طلبہ کے لئے یاری دوستی کے مخالف تھے۔ یوں رفاقت بہت سے لوگوں اور بہت سے طلبہ سے رہی لیکن گہرا دوست جس سے دل ملتا ہو ایسے بہت کم ہوئے۔

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

سہارنپور پہنچنے کے کچھ عرصے بعد مولانا یونس صاحب جونپوری سے اچھا خاصا تعلق ہو گیا تھا، خصوصاً میرے دورے کے سال جب کہ میرا اور ان کا دونوں کا قیام احاطۂ دفتر (مدرسہ قدیم) میں تھا اور اسکے بعد کے دور میں بھی یعنی سن ۱۹۶۵ء کے اخیر اور سن ۱۹۶۶ء میں بھی اسی احاطے میں قیام تھا۔

علوم حدیث کی طرف میری دل چسپی کے کئی عوامل میں سے ایک عامل مولانا یونس صاحبؒ سے تعلق بھی ہے۔ اس کا ذکر میں نے ''مظاہر علوم کے دورِ طالب علمی کی یادیں'' میں کیا ہے۔

لقاء الناس ليس يفيد شيئاً　　سوى الهذيان مِن قيل و قال

فأ قلل مِن لقاء الناس إلاّ　　لأخذ العلم أو إصلاح حالٖ

''لوگوں سے میل جول کوئی فائدہ نہیں دیتا سوائے فضول باتوں کے، لوگوں سے ملنا جلنا کم رکھا کرو، بس یا تو علم حاصل کرنے (کے لئے ملو) یا اپنے اصلاحِ حال (اپنی کسی ضرورت) کے لئے''۔

تاہم اگر میل جول پیدا کرنا ہی ہو تو پڑھنے کے شوقین لڑکوں سے کیا جائے۔

اِرشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: المرء على دين خليله، فلينظر أحد كم مَن يخالل ''آدمی اپنے دوست کے طور وطریق پر ہو (جا) تا ہے اس لئے تمہیں یہ دیکھ لینا چاہئے کہ کس سے دوستی بنا رہے ہو'' (أحمد، ترمذی أبو داود، بیهقی فی شعب الایمان عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ کما فی المشکاة رقم ۵۰۱۹)

تیسرا باب

زمانۂ تدریس کا آغاز

دیوبند کے باشندہ مولانا شفیق احمد خاں صاحبؒ (م ۲۰۱۳ء) نے شہر سیلم (تمل ناڈو) کی جامع مسجد میں مدرسہ قائم کیا تھا جہاں وہ امام تھے، ان کا حضرت شیخ الحدیث

مولانا زکریا صاحبؒ کے یہاں آنا جانا تھا وہ غالباً ان کے مرید تھے۔ وہ مجھے وہاں دیکھتے تھے کہ حضرت شیخؒ کے تالیفی کاموں میں معاون ہوں، حضرت کے کاتبانِ خطوط تو زیادہ تر دوسرے تھے لیکن کبھی علمی مراسلت ہوتی تو ایسے خطوط وہ مجھ سے لکھواتے تھے، کبھی کسی علمی مسئلے میں، کسی حدیث کے بارے میں گفتگو ہوتی تو وہاں کے موجود نوجوانوں میں ایسی گفتگو مجھ سے بھی ہوتی تھی، ایسی کچھ باتیں دیکھی ہونگی، انھوں نے حضرت شیخؒ سے میری غیر موجودگی میں درخواست کی کہ اس نوجوان کو میں اپنے مدرسہ مظاہر العلوم (سیلم) لیجانا چاہتا ہوں، حضرت شیخؒ نے یہ بات ایک روز میرے سامنے رکھی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں تو آپ کے حوالے ہوں والد صاحب نے بھی مجھے یہیں بھیجا ہے آپ جو بہتر سمجھیں وہ طے کریں۔

حضرت شیخ میرے استاد تھے، میرے سارے حلقے کے مسلَّم بزرگ تھے، جس کام کے لئے اور جس توقع پر انھوں نے مجھے دہلی سے باصرار بلایا تھا (جس کا ذکر ''مظاہر علوم کے دور طالب علمی کی یادیں'' میں ہو چکا ہے) میں ان کے لئے مفید بھی ثابت ہو رہا تھا، اور مسودہ ان کا اگر چہ ان کے داماد مولانا محمد عاقل صاحب لکھتے تھے میں حوالے تلاش کرنے اور ان کے اقتباسات املاء کر کے لکھوانے کے کام میں تھا، بعد میں جب مولانا عاقل صاحب کو مدرسہ مظاہر علوم میں جلالین کا سبق دیا گیا تو درس کا وقت حضرت کے تالیف کے وقت سے ٹکراتا تھا چنانچہ اس کے بعد مسودہ بھی میرے ہی قلم سے تیار ہونے لگا، یہ بات حضرت شیخؒ نے میرے ہی قلم سے اپنے روزنامچہ کے رجسٹر میں لکھوائی بھی تھی۔ ان باتوں کا ذکر مذکورہ کتاب میں آچکا ہے۔

لیکن ایک بات جس کو محسوس کیا جا سکتا ہے بیان کرنا آسان نہیں اور جس حد تک بیان ہو سکے بیان کر دینے میں اب حرج بھی کچھ نہیں، یہ بات وہ ہے جس کا ذکر حدیث

عائشہؓ في الصحيحين وحديث ابن مسعودؓ عند الطبراني میں کیا گیا ہے کہ الأرواح جنود مجندہ فما تعَارَفَ۔۔۔ یعنی روحیں اللہ کی طرف سے (دنیا میں) بھیجے ہوئے لشکر ہیں جولوگ (فطرۃً صفات واخلاق میں) باہم موافق ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے سے قریب ہوجاتے ہیں (دنیا میں وہ ہم نوا اور دوست بن جاتے ہیں) اور جہاں یہ بات نہیں ہوتی ان میں اختلاف ہوجاتا ہے (دوریاں پیدا ہوجاتی ہیں)

(ملاحظہ ہوالجامع الصغیر مع شرحہ فیض القدیر جلد ۳ ص ۱۷۴)

میں محسوس کرتا تھا کہ حضرتؒ کو بھی میرے جیسے ایک چست ونشیط نوجوان کی ضرورت ہے جو کتابوں کا کیڑا ہو اور کتابوں میں گھسے رہنے کا شوق بھی رکھتا ہے اور مجھے بھی ایک بڑے اور تجربہ کار صاحبِ مطالعہ عالم کی اپنی زندگی کے اِس رواں مرحلے میں ضرورت ہے تاکہ میں ان کی رفاقت سے کچھ سیکھوں، میرے والد الحمد للہ موجود تھے انھوں نے مجھے فارغ بھی کر رکھا تھا لیکن نہ جانے کیوں لگتا یہ تھا کہ میں فطرۃً اس ماحول کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہوں، میں یہاں ہوں اور الحمد للہ عزت سے ہوں لیکن میں اس ماحول میں پوری طرح فٹ نہیں ہوں۔ کیوں؟ کس طرح؟ ـــــ نہیں معلوم! یا یہ کہ معلوم بھی ہے تو اس وقت کی ناپختہ عمر میں اس کا سمجھنا آسان نہیں تھا۔ ہم اس کو شاید طبعی عدم مناسبت کا لفظ دے سکتے ہیں (بہت بعد کو جو ہمارے اور اس حلقے کے درمیان مختلف اسباب کی وجہ سے کچھ دوریاں پیدا ہوئیں، اس وقت تک ان کا کوئی شائبہ نہ تھا۔)

اور یہی وہ حقیقت ہے جسکو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس نہایت بلیغ ارشاد میں بیان فرمایا ہے: اعملوا فکل مُیَسَّر لِما خُلِق له ''کام میں لگے رہو ہر شخص کے لئے (رفتہ رفتہ تکوینی طور پر) وہی کام آسان کر دیا جائے گا جس کے لئے (فیصلۂ ازل کے لحاظ سے) اسے پیدا کیا گیا ہے۔'' (یہ حدیث بخاری مسلم کے علاوہ بہت سے محدثین

نے متعدد صحابۂ کرام ؓ سے نقل کی ہے دیکھئے مشکاۃ، باب الایمان بالقدر، رقم ۸۵)

اندرونی، غیر واضح فاصلوں اور طبعی عدم مناسبت کو محسوس تو حضرت ؒ نے بھی کر لیا تھا اور میں نے بھی لیکن حضرت شیخ ؒ مجھے اپنے پاس سے رخصت کر دینے کی ذمہ داری شاید اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے تھے، مجھے وہاں رہنے میں دشواری تو کچھ نہیں تھی لیکن میں اتنا تو بہر حال سمجھتا ہی تھا کہ میں اپنی کوئی خواہش اپنے استاذ کے سامنے ظاہر نہ کروں یعنی یہ نہ کہوں کہ ٹھیک ہے میں وہاں چلا جاتا ہوں اور واقعۃً مجھے وہاں جانے کا کوئی شوق بھی نہیں تھا، نہ حصول معاش کا اس وقت کوئی تقاضا تھا۔

چنانچہ حضرت شیخ ؒ نے ایک دن پھر مجھ سے تنہائی میں پوچھا کہ ''پیارے تو نے کیا سوچا وہاں مدرسے جانے کے بارے میں؟'' ظاہر ہے اگر میں پورے انشراح صدر کے ساتھ وہاں خود کو ہر طرح فٹ پاتا تو میں کہہ دیتا کہ ''نہیں حضرت! میں آپ ہی کے پاس رہوں گا، میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے''۔ لیکن میں نے عرض کیا ''حضرت! میں کیا کہہ سکتا ہوں آپ جو بہتر سمجھیں'' آخر حضرت شیخ ؒ نے فرمایا کہ ''اچھا یہی ہے تم وہاں چلے جاؤ، تمہاری شادی بھی ہو چکی ہے تمہارے والد کو بھی تمہاری ملازمت ہو جانے سے کچھ سہولت ہو جائے گی''۔

اور اس طرح میرا تمل ناڈو جانا ہو گیا۔

سیلم (تمل ناڈو) کا قیام

تمل ناڈو بلکہ پورے جنوبی ہند میں میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بہت گہرا اور غیر معمولی اثر اور اُن سے وہاں بہت زیادہ عقیدت تھی۔ وہاں کے لوگ یہ سمجھتے تھے۔ غلط یا صحیح۔ کہ جس گمراہ کو دنیا کی کوئی طاقت راہ راست پر نہ لا سکے ''دِلّی مولانا'' کی ایک گفتگو سے وہ سیدھا ہو جائے گا۔

یہ مدرسہ مظاہر العلوم شہر سیلم کے بیچوں بیچ وہاں کی جامع مسجد میں قائم تھا، یہ شہر بڑا شہر اور ضلع ہے، سٹی بسیں چلتی ہیں اور صنعتی شہر ہے، وہاں کے مسلمان الحمد للہ اچھی مضبوط مالی حالت میں ہیں، مولانا شفیق خاں صاحبؒ سے پورے شہر کو اس وقت بہت عقیدت بھی تھی۔

وہاں کے لوگوں کے مزاج سے ہم آہنگی

میں شمالی ہند میں پیدا ہوا پلا بڑھا، میں سیلم میں شاید ڈھائی تین سال سے زیادہ نہیں رہا لیکن مجھے وہاں کے لوگوں کا عام مزاج اپنے علاقے کے عام مزاج سے زیادہ پسند آیا، ہندو مسلم نفرت نام کو نہ تھی، اب ہمارے علاقوں کے فاسد ذہن اور فرقہ پرست لوگوں نے وہاں یہ مزاج پیدا کیا ہے لیکن اب بھی فرقہ وارانہ فساد کا نام ونشان وہاں نہیں ہے، بہت پست سطح پر سمجھے جانے والے لوگ بھی سخت جھگڑے میں ہاتھا پائی تک نہیں گر جاتے، وہاں کے موسم یہاں سے زیادہ پسند آئے وہاں کا چاول کا کھانا مجھے ذرا بھی ناموافق نہ تھا، موافق بھی تھا پسند بھی تھا۔ ان لوگوں نے میری رعایت میں روٹی بنوانے کا اہتمام کیا مگر ان کو روٹی بنانی نہیں آتی ہے اسلئے کچی پکی ٹیڑھی میڑھی سی ہوتی تھی، میں نے معذرت کر دی، میں نے کہا مجھے آپ کے چاول ہی پسند ہیں۔

یہاں یہ بتا تا چلوں کہ وہ ''روٹی'' پراٹھے یا روغنی روٹی کو ہی کہتے ہیں اور وہ ان سے بن بھی جاتی ہے سادہ روٹی بغیر چکنائی کی وہ جانتے ہی نہیں۔

وہاں کے خوشگوار موسم

مدرسہ کی نئی عمارت شہر سے دور ''یم مائینس''، سیلم نمبر ۵ میں (ایک چونے جیسے پتھر کی کان) کے قریب پہاڑی علاقے میں بن رہی تھی چند ماہ کے بعد سن ۱۹۶۷ء میں

مدرسہ وہاں منتقل ہو گیا تھا جہاں کی آب و ہوا بہت ہی خوشگوار بلکہ بے خود کر ڈالنے والی تھی، میں کبھی کبھی کھڑکی کھول کر آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو جاتا اور فرفر آتی ہوئی خوشگوار ہوا کا خوب لطف لیا کرتا تھا۔ گرمی کے موسم میں گرمی ہلکی سردی کے موسم میں گلابی سردی۔ ایک بار موسم یونہی برائے نام ٹھنڈا ہوا تھا تو فجر کی نماز کے وضوء کے لئے گرم پانی لا کے دیا گیا میں نے کہا یہ کیوں؟ طالب علم نے کہا: حضرت! ٹھنڈی ہے نا؟ مجھے ہنسی آئی کہ ہم تو دسمبر جنوری میں بھی وہ بھی دہلی کی سردی میں اُس عمر میں گرم پانی کی تلاش نہیں کرتے، یہ تمل ناڈو کی سردی کے بھی آغاز میں گرم پانی لا رہے ہیں، مگر خیر ان کی محبت تھی میں نے وہ استعمال کیا۔ جزاھم اللہ خیراً۔

وہاں اس علاقے کی سخت سردی میں بھی رات کو ایک چادر کافی ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار وہیں مستقل سکونت اختیار کر لینے کا ذہن بنا لیا تھا، والدہ مرحومہ سے ذکر کیا وہ آمادہ نہ تھیں، والد صاحبؒ سے کہتا تو وہ تو شاید اجازت دیدیتے مگر والدہ مرحومہ کسی طرح راضی نہ ہوئیں، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے اس بات کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ اسوقت میرے غالباً دو بچے ہو چکے تھے، اپنے بہن بھائیوں میں بڑا میں ہی تھا کسی اور کی کوئی اولاد اسوقت تک نہ تھی آخر دادی اپنے پوتا پوتی کو کیسے اپنی نگاہوں سے دور کر دیتی؟

اور ٹھیک ہی ہوا، وہ ایک وقتی عبوری کیفیت تھی ورنہ دِلّی والوں سے دِلّی کہاں چھوٹتی ہے، ملک کے مرکز میں علم، تالیف، طباعت اور علمی سرگرمیوں کے جو مواقع میسر ہیں وہ کہیں اور کہاں؟

روشنی بڑھانے کی ترکیب

محترم حضرات! باوسائل بندوں کے ٹھاٹ اور ہوتے ہیں لیکن اللہ کے بے وسیلہ

لوگ بھی کچھ نہ کچھ اپنی تدبیریں کر ہی لیتے ہیں، سلیم کے مدرسے کی نئی عمارت میں شروع میں لائٹ نہیں تھی، میری چارپائی کے سرہانے چارپائی کی ہی اونچائی کا طاق تھا۔ میں اس میں لال ٹین رکھتا اور اس کے پیچھے دیوار سے لگا کر ایک بڑا آئینہ رکھ دیا تھا، اس طرح سامنے لال ٹین کی لائٹ اور شیشے کا عکس دونوں مل کر ڈبل روشنی ہو جاتی تھی، گویا ڈبل خرچ کے بغیر دوگنی روشنی مل جاتی تھی۔ اس طرح چارپائی پر لیٹ کر تیز روشنی میں مطالعہ کرنا ممکن ہو جاتا تھا۔

چاول سے ہم آہنگی

ہمارے علاقوں کے لوگ جب کہیں بھی چاول کی دنیا میں جاتے ہیں تو ایک دو دن سے زیادہ روٹی کے بغیر ان سے نہیں رہا جاتا، لیکن مجھے الحمد للہ کوئی دِقت نہ تھی، یہاں دوبارہ پھر وہی ارشاد نبوی یاد کر لیجئے کہ **کل میسر لما خلق له** ''ہر شخص کے لئے (قدرتی طور پر) وہی کچھ کرنا آسان کر دیا جاتا ہے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے''، پھر چاول کو جن دوسری شکلوں میں وہ بناتے ہیں اِڈلی، ڈوسا یا کسی اور شکل میں وہ بھی مجھے پسند تھا، اب چند سال سے جو ملک بھر کے ایک جگہ کے مطعومات ومشروبات دوسرے ملکوں اور علاقوں میں روشناس بلکہ مقبول ہوئے ہیں اور دہلی میں بعض مقامات پر ڈوسا ملنے لگا ہے تو میں کبھی کبھی تلاش کر کے وہاں ڈوسا کھانے جاتا ہوں، اور عجیب بات تو یہ ہے کہ نسل در نسل دلّی والی ہماری حرمِ محترم (حفظہا اللہ) کو بھی یہ پسند آتا ہے۔

لسانی اور تہذیبی لحاظ سے تمل ناڈو کے دو حصے

تمل ناڈو کی مسلم آبادی کو لسانی اور تہذیبی لحاظ سے دو حصوں میں منقسم سمجھنا چاہئے
کچھ تمل زبان اور تمل تہذیب وتمدن والے علاقے میں جہاں مسلمان اور دیگر تمام لوگ صرف اور صرف تمل بولتے اور تمل ہی سمجھتے ہیں اردو کا ایک لفظ تک نہیں جانتے یا یوں کہوں کہ آج سن دو ہزار بیس میں تو شاید ہر علاقے میں کچھ نہ کچھ اردو سمجھی جانے لگی ہوگی لیکن اُس زمانے میں (سن ٦٧-١٩٦٨ء) میں تمل والے علاقوں میں اردو کا کوئی ایک لفظ بھی نہ سمجھتا تھا۔

اس علاقے کی اردو سے بیگانگی کا ایک لطیفہ

ایک بار ایسا ہوا کہ قدیم شہر سے یم مائینس (یعنی سیلم نمبر ۵/ جہاں مدرسہ بعد میں منتقل ہوگیا تھا) جانے کے لئے میں بس میں سوار ہوا، جب کنڈکٹر ٹکٹ دینے آیا اور میں نے اپنی منزل کا نام لیا تو اس نے کہا ''اِئے'' (وہاں نہیں جائے گی) یہ ایک لفظ تو میں جان گیا تھا لیکن اس سے آگے ع

''زبانِ یارِ مَن ترکی وَمَن ترکی نمی دانم''

کا منظر تھا، میں نے اشارے سے کہا کہ مجھے آنے والے اسٹاپ پر اتار دو، میں اتر گیا، اب میں ایسی برزخ میں تھا کہ ع

''ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا''

وہ دنیا نہ میری سابقہ دنیا تھی نہ آنے والی دنیا، ایک مانوس علاقے سے نکل چکا ہوں دوسرے مانوس علاقے میں ابھی پہنچا نہیں ہوں۔ زندگی میں کبھی ایسا بالکل ہی اجنبی ماحول نہیں دیکھا تھا۔ علاقہ از حد اجنبی، میں نے دکانوں پر نظر ڈالی تو ایک باریش بوڑھے نظر آئے، غضب یہ تھا کہ لوگ لفظ ''مسجد'' تک نہیں جانتے تھے، جی ہاں! مسلمان

نمازی، متقی، مؤمن شکل، مگر مسجد کے لفظ سے نا آشنا، مگر میں اتنے دن میں مسجد کا متبادل لفظ ''پلی وَاسَل'' سیکھ چکا تھا اور ''کہاں ہے؟'' کے لئے ''ینگے؟'' بھی آ گیا تھا، مجھے اس مشکل گھڑی میں یہی دو لفظ ''مشکل کشا'' نظر آئے۔ میں نے اُن بڑے میاں سے یہی کہا:

''پلیِ واسل ینگے؟''

میں نے غور کرلیا تھا کہ علاقہ کتنا ہی اجنبی ہو مسجد کا امام و مؤذن کچھ نہ کچھ اردو ضرور جانتے ہونگے اسلئے میں نے مسجد سے اپنی دشواری کا حل سوچا، سبحان اللہ! ہمارے لئے خدا کے گھر سے بڑھ کر اور کیا ٹھکانا ہوسکتا ہے! ففِرّوا اِلی اللہ ''مُلاّ کی دوڑ مسجد تک'' ان صاحب نے اشارے سے بتایا میں آگے بڑھا نزدیک ہی مسجد تھی، جیسے ہی میں مسجد کے دروازے پر پہنچا ہمارے ہی مدرسے کا ایک طالب علم وہاں مؤذن تھا مجھے دیکھتے ہی حیرت سے بولا کہ ''حضرت! آپ یہاں کہاں؟'' میں نے دشواری بتائی تو وہ میرے ساتھ ساتھ مدرسہ تک آیا۔

تمل ناڈو کا یہ علاقہ جہاں صرف تمل جاننے والے لوگ ہیں یہاں کے مسلمان ''لَبابِن'' کہلاتے ہیں، اور اتفاق سے سیلم شہران ہی علاقوں میں آتا ہے۔

وہاں کی علاقائی اردو زبان کی خصوصیات

لسانی وتہذیبی لحاظ سے دوسرا علاقہ وہ ہے جہاں اردو بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے اردو رسائل بھی نکلتے ہیں اردو شاعری بھی ہوتی ہے، یہ مسلمان ''دکھنی'' کہلاتے ہیں۔ ان کی مادری زبان اردو ہی ہے مگر علاقائی زبان تمل بھی بولتے سمجھتے ہیں۔ میل وشارم اور وانِیَمباڑی وغیرہ ایسے ہی اردو والے علاقے ہیں۔

ادبی اور کتابی زبان تو بہت حد تک ہماری سی ہی ہے البتہ بہت سے اسماء بھی

بدلے ہوئے ہیں اور افعال بھی اور عام بول چال کا اگر ہم تجزیہ کریں تو تمل زبان ومحاورات کا ٹھیک ٹھیک لفظی ترجمہ ہے، اس کی دو مثالیں دیکھتے چلئے:

(۱) تمل معاشرے میں جب کوئی کسی سے رخصت ہوکر چلتا ہے تو کہتا ہے ''پوئی ٹو وَرّیں'' (جاکے آتا ہوں) وہاں کے اردو والے اس موقع پر بولتے ہیں ''جاکو آتوں''ـــــ شروع میں جب میرے سامنے کسی نے رخصت ہوتے وقت یہ لفظ بولا تو میں یہ سمجھا کہ یہ صاحب کسی وجہ سے دوبارہ آنے والے ہیں، مجھے انتظار کرنا چاہئے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ جو بات تھی پوری ہوچکی ہے مزید آنے کی ضرورت تو فی الحال نہیں ہے، اسلئے احتیاطاً میں نے یونہی ایک بار کسی سے پوچھ لیا کہ'' آپ کیا ابھی دوبارہ آرہے ہیں؟'' انھوں نے کہا نہیں حضرت!

کچھ دن بعد سمجھ میں آیا کہ یہ ان کے بولنے کا ایک طریقہ ہے دوبارہ آنے کا وعدہ نہیں ہے۔ پھر جب ہم نے بعض لوگوں سے اس انداز گفتگو اور اس لفظ کے بولنے کی وجہ جاننی چاہی تو واقعی معقول وجہ ظاہر ہوئی:

انھوں نے بتایا کہ وہ ''جانا'' جس کے بعد کبھی واپسی نہ ہو وہ تو زندگی کا آخری سفر ہوتا ہے اس لئے اس بدشگونی سے بچنے کے لئے تمل زبان میں یہ بولا جاتا ہے، اردو والے بھی اسی کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔

(۲) تمل زبان میں ایک لفظ ''برسوں'' یا ''سالہا سال'' کے لئے بولا جاتا ہے ''تنیا پوڑے'' (یا کچھ اس سے ملتا جلتا لفظ) اس کا مطلب ہے پانی پڑنا اور مراد ہے کئی برساتیں گزر جانا۔ وہاں کی اردو میں اس مفہوم کے لئے اسی لفظ کا ترجمہ کردیتے ہیں ''پانی پڑے''ـــــ ہمارے یہاں سال کے لئے جو ''برس'' بولتے ہیں اسکا تعلق بھی کہیں نہ کہیں برسات ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اردو زبان کا احترام

لیکن عجیب بات یہ دیکھی کہ وہاں کے تمل مادری زبان والے اردو کا احترام کرتے ہیں اور تحقیق وتلاش سے پتہ چلا کہ یہ زبان چونکہ عربی کی طرح داہنی طرف سے اور اسی کے حروف میں لکھی جاتی ہے اسلئے اسکا احترام قرآنی زبان کی مشابہت کی وجہ سے ہے۔ سبحان اللہ! وبارک اللہ فیھم۔ سچ پوچھئے تو یہ تقوی القلوب کا حصہ ہے یعنی قرآن مجید اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، ان کی زبان سے محبت ہے اور جو زبان اس زبان کے مشابہ ہے اس سے بھی محبت ہے۔ اللہ اکبر!

"بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است"

مولانا شفیق خاں صاحبؒ جو مدرسہ کے بانی اور مہتمم تھے اور جامع مسجد کے خطیب وامام تھے وہ اکثر جمعہ کے خطاب کے لئے مجھے دعوت دیتے تھے، ایک دوبار میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدت مند جب نماز جمعہ کے بعد مجھ سے ملے جو ایک لفظ بھی اردو نہیں جانتے تھے پتہ چلا کہ وہ تقریر سننے ہی کے لئے اس مسجد میں آکر جمعہ پڑھتے ہیں، میں نے ترجمان کے ذریعے پوچھا کہ آپ اردو تو جانتے نہیں! بولے کچھ کچھ سمجھ لیتے ہیں اور اس کے علاوہ اردو سے ہمیں عقیدت ہے۔

مطالعے کے لئے پرسکون ماحول

سیلم کا زمانہ کئی لحاظ سے میری زندگی کا (میرے لئے) یادگار زمانہ ہے، اب حالانکہ برسوں سے وہاں سے اور وہاں والوں سے کوئی خاص رابطہ نہیں ہے لیکن وہاں کی یادیں دل میں بسی ہوئی ہیں۔

علاقے اور علاقے کی زبان سے اجنبیت پھر مدرسے کی شہر سے دوری ایک لحاظ سے میرے لئے وہاں رحمت ثابت ہوئی، وہاں نہ کوئی دوست احباب بنے، نہ کوئی رشتے

ناتے والے تھے نہ کوئی اور مشغلہ نہ گھر بار تھا کہ الگ تھلگ رہتے ہوئے بھی بہت سے کام کرنے ہی پڑ جاتے ہیں، نہ بیوی نہ بچے نہ ماں باپ نہ اپنی طرف متوجہ کرنے والا کوئی شخص نہ کام۔بس مطالعہ اور پڑھانا، درسی کتابوں کا مطالعہ اور جو وقت بچتا تو دیگر کتب کا مطالعہ، خود کا مطالعہ، فطرت کا مطالعہ، خود کلامی، خود سازی، بھرپور فرصت تھی، یہ صورتِ حال کسی دوسرے کے لئے ''قیدِ تنہائی'' ہوسکتی تھی، اُکتاہٹ کا سبب بن سکتی تھی لیکن میرے لئے الحمدللہ تعمیر خویش کے قیمتی لمحات اور زریں موقع تھا۔اپنے کمرے کی اندر سے کنڈی لگائی اور اپنی چھوٹی سی الگ دنیا بسالی۔اس قدر مکمل اور ہمہ گیر سکون کا زمانہ نہ اس سے پہلے کبھی ملا تھا نہ اس کے بعد، حالانکہ مجموعی حیثیت سے زندگی پُرسکون ہی ملی ہے والحمدللہ!

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کھانے کا نظام

کھانا مدرسہ میں خرچہ دے کر سب اساتذہ اپنا تیار کراتے تھے، کھانا تیار ہوا بچوں نے اطلاع دی اٹھے کھانا کھایا چلے آئے۔

آپ کو حیرت ہوگی، جب طلبہ کھانے کے لئے بلانے آتے تو وہ کھٹکا کریں، میں پوچھوں کون؟ وہ کہیں: میں فلاں! میں پوچھوں کیا بات ہے؟ وہ کہیں کھانا آگیا ہے! میں کہوں اچھا آتا ہوں۔اس لمبے سلسلے سے بھی بچنے کے لئے میں نے کہہ رکھا تھا کہ جب کسی اور کام کے لئے نہیں صرف ناشتے اور کھانے کے لئے بلانا ہو تو اسطرح کھٹکا کیا کرو:

''کھٹ کھٹ ــــــ کھٹ''

یعنی دو بار لگاتار اور پھر دو سکنڈ رک کر کھٹکا کرو میں کہوں گا ''اچھا'' بس۔اس میں

دوطرفہ راحت تھی۔

اللہ جزائے خیر دے اور توفیق خیر و سعادت بخشے کھانا لانا، اس کے لئے اساتذہ کو بلانا یہ کام عموماً عزیز انیس احمد خاں سلمہ، پسر مولانا شفیق احمد خاںؒ کرتے تھے، ناشتہ، کھانا تمام اساتذہ کا ایک ہی کمرے میں ہوتا تھا۔ یہ عزیز انیس احمد سلمہ جو اَب ماشا ٔاللہ مولانا انیس احمد خاں قاسمی مہتمم مدرسہ مظاہر علوم (سیلم) ہیں حفظہ اللہ ورعاہ۔

وہاں کھانے میں ایک نئی چیز یہ دیکھی کہ دسترخوان پر گرم پانی رکھا ہوا ہے ٹھنڈا یا سادہ پانی ندارد، میں نے پوچھا: یہ ہاتھ دھونے کا پانی پہلے ہی لا کے رکھدیا گیا؟ جواب ملا یہ پینے کا پانی ہے، معلوم یہ ہوا کہ کھانے کے دوران اور جو کوئی پیے کھانے کے بعد وہاں گرم ہی پانی پینے کا رواج ہے، سمجھ میں آیا کہ چاول کے دیس میں یہ رواج بہت مناسب ہے، بچپن سے بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے تھے کہ چاول کے اوپر ٹھنڈا پانی پینے سے چاول کھڑا ہو جاتا ہے یعنی سخت ہو جاتا ہے اسلئے ہم نے بھی وہی معمول اپنا لیا تھا۔ جیسوں میں رہو ویسے ہی بن کے رہو ورنہ وہاں نہ رہو، إلاّ أن يشاء الله۔

وہاں چونکہ گرمی زیادہ نہیں پڑتی اسلئے وہ لوگ کھانے کے علاوہ بھی ٹھنڈا پانی نہیں پیتے اور برف کے پانی کا تو تصور ہی نہیں۔

ایک بار مدرسہ میں ایک جلسہ میں دہلی یوپی کے بہت سے لوگ آنے والے تھے موسم گرمی کا تھا (وہاں کی جیسی بھی گرمی تھی) انھوں نے سوچا دہلی کے لوگ برف کا پانی پیتے ہیں لہٰذا ایک بڑے ٹب میں پینے کا پانی رکھا اور اس میں برف بھی ڈالدی، میں نے پوچھا برف کو بھی کہا تھا وہ بھی تو لاؤ! بولے ''ہاؤ حضرت! ہے برف ڈالی سو'' میں نے کہا اسمیں تو کہیں نہیں! انھوں نے مجھے انگلی نزدیک کر کے دکھایا کہ یہ ہے نا!۔

دیکھا تو تقریباً دس بیس گرام کی ایک چھوٹی سی ڈلی ایک طرف کو تیر رہی تھی، میں

نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھیلا کر بتایا اتنی بڑی سلّی لا کر ڈالو ـــــ وہ غریب اس کلچر و ثقافت ہی سے نا آشنا ہیں۔

مطالعے کے لئے دل چسپی اور لگن کے ساتھ ساتھ فراغت اور اس سے بھی بڑھ کر ذہن کی یکسوئی بہت ضروری چیز ہے۔ ''دال آٹے'' یعنی گھریلو کاموں میں الجھا ہوا ذہن چاہے کتاب سامنے رکھی اور نظر کتاب کے ورق پر ہی کیوں نہ ہو مگر وہ مطالعہ نہیں کر رہا ہوتا ہے وہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں میں مشغول ہوتا ہے، بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ اِني لأُجَهِزُ جَيشي و أنا في الصلاة (میں نماز میں ہوتا ہوں اور لشکر تیار کر رہا ہوتا ہوں) مطلب یہ نہیں ہے کہ میں جان بوجھ کر یہ کرتا ہوں بلکہ ذہن میں خود بخود یہ چلتا رہتا ہے۔

میری اردو زبان کا فروغ

یہاں مجھے جو خاص چیز ـ بفضل اللہ و حُسنِ توفیقہ ـ ملی وہ کاموں سے فرصت کے ساتھ ساتھ ذہنی یکسوئی ملی، چنانچہ میری زندگی کی سب سے پہلی تالیف رمضان کیا ہے یہیں لکھی گئی، اور اس کتاب کی زبان اور مضامین کے بارے میں حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقدمہ کتاب میں لکھا تھا کہ:

> ''رسالۂ نافعہ ''رمضان کیا ہے'' مؤلفہ عزیز محترم مولانا محمد عبداللہ طارق ابن حضرت مولانا محمد رحمت اللہ میرٹھی ثم الدہلوی زید مجدہما احقر کے سامنے ہے اور میں حظ لے لے کر اس رسالے سے مستفید ہو رہا ہوں، عبارت کی روانی و سلاست، مضامین کی بلندی و رفعت اور عنوان و بیان کی فصاحت و بلاغت نے رسالے کو اس قدر دل چسپ بنا دیا ہے کہ ہر پچھلی سطر اگلی سطر تک گویا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہے کہ اُسے پڑھا جائے، ایسے نوجوان عالموں کا ایسے

دورِ قحط الرجال میں وجود بہت کچھ امید افزا اور روشن مستقبل کی دلیل ہے''۔

یہ مقدمہ حضرت قاری صاحبؒ نے سن ۱۳۸۹ھ ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا، جب کہ اس سے پہلے میرا وقت یا تو مدرسہ کاشف العلوم تبلیغی مرکز میں گزرا جہاں لکھنے پڑھنے اور زبان کے نکھرنے کا کوئی ماحول نہ تھا، یا حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں گزرا، وہاں میرا مشغلہ حضرت کے ساتھ عربی کتب اور بخاری کے شروح وحواشی کا تھا۔

یہ میری اردو زبان جو کچھ بھی تھی۔ بفضل اللہ تعالیٰ۔ والدین کی عطا تھی یا سلیم کے زمانے میں اردو کتب کے مطالعے کی دَین تھی۔ گویا اردو دنیا سے بہت دور لیجا کر اردو زبان کو نکھارا گیا۔

اردو زبان کے فروغ اور نکھار میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی کتابوں کا مطالعہ بھی معاون ثابت ہوا، بالخصوص ان کی کتاب ''الغزالی'' کا مطالعہ میں نے اہتمام سے کیا تھا، مولانا سید مناظر گیلانیؒ کی کتابیں بھی اس زمانے میں بغور پڑھیں ''النبی الخاتم'' نظامِ تعلیم وتربیت ''ہزار سال پہلے'' کے علاوہ ان دنوں بہت قدیم مطبوعہ ان کی مختصر سی مگر بے مثال کتاب ''کائناتِ روحانی'' بھی بغور پڑھی تھی۔

سہل نگاری

مضمون یا کتاب لکھنے میں خود بخود میرے ذہن میں یہ جذبہ تھا کہ زبان آسان لکھی جائے، جس طبقے کے لئے ہم لکھ رہے ہیں اس کے لئے قابل فہم ہونا بے حد ضروری ہے، یہ بات میرے ذہن میں تعلیم الاسلام جیسی کتابوں کو دیکھ کر آئی تھی، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ ہندوستان کے مفتیٔ اعظم اور بڑے عالم تھے، اگر وہ یہ کتاب اپنی علمی سطح کے لحاظ سے لکھتے تو وہ بچے کیسے سمجھتے جن کے لئے وہ لکھی گئی ہے۔ اسلئے میرا رجحان

شروع ہی سے آسان زبان لکھنے کا رہا ہے۔

مأخذ کے حوالوں کا انداز

مأخذ کے حوالوں کے سلسلے میں روزِ اوّل ہی سے میری طبیعت نے دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کا طریقہ پسند کیا تھا۔ یعنی ہر بات جلد اور صفحہ نمبر کے ساتھ لکھی جائے، بلکہ سنِ طباعت بھی لکھا جائے، کسے خبر تھی کہ ایک دن اللہ تعالیٰ مجھے ندوۃ المصنفین کا ایک نو وارد شریک انجمن بنانے والا ہے چنانچہ آئندہ سطروں میں آپ دیکھیں گے کہ اسی انداز کی وجہ سے اور شاید صاف ستھری نکھری ہوئی رواں زبان کی وجہ سے حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ نے مجھے ندوۃ المصنفین میں مدعو فرمایا اور اس کا رفیق بنا لیا۔

وکیل شریف کی یاد

یادش بخیر، سلیم کے ایک اچھے کامیاب وکیل تھے محمود شریف صاحب، علماء اور اہل دین سے رغبت رکھتے تھے مجھ سے خاص طور پر زیادہ مانوس ہو گئے تھے، ایک بار گھر آنے کی دعوت دی، چھٹی کے دن گاڑی بھیجدی ان کے گھر جانا ہوا، دیگر باتوں سے فارغ ہو کر فرسٹ فلور پر وہ اپنی لائبریری دکھانے لے گئے جو ایک بڑے ہال میں بھرپور لائبریری تھی، یعنی اِک شخصی گھریلو لائبریری جیسی ہونی چاہئے اس لحاظ سے بہت اچھی وسیع لائبریری تھی۔

آپ اندازہ کیجئے کہ خشکی میں دن گزار رہی ایک مچھلی کو صاف پانی کی ایک پوکھر بلکہ بڑی جھیل میں چھوڑ دیا جائے، خشک پہاڑی علاقے میں پھنسی شہد کی مکھی کو پھلوں اور

پھولوں کا بھرا پُرا باغ مل جائے تو اس کی مسرت کا کیا عالم ہوگا۔

میں سوچنے لگا کہ تمل ناڈو میں اور وہ بھی خالص تمل علاقے میں یہ لائبریری ایک نعمت عظمیٰ ہے، میں مطالعے میں مصروف ہوگیا اور وکیل صاحب کو میں نے فارغ کر دیا۔ وہ اس بات سے خوش تھے کہ انھوں نے اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کیا ہے اور خود ان کو مطالعے کی زیادہ فرصت نہ تھی اچھا ہے کوئی اس سے فائدہ اٹھالے۔

انھوں نے بعد میں کہا کہ چھٹی کے دن آپ یہیں آجایا کریں اور جو کتاب آپ چاہیں مدرسہ میں بھی لیجا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اکثر و بیشتر چھٹی کے دن کبھی رات سے صبح تک کے لئے اور کبھی چند گھنٹوں کے لئے ان کے یہاں آجاتا تھا، میرے حساس۔ بلکہ ذکی الحس۔ ذہن نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ میرے آنے سے ذرا بھی اکتائے ہوں، بلکہ جب کبھی میں رات کو ان کے یہاں ہوتا تو وہ میرے لئے بستر، جانماز، پانی وغیرہ لائبریری میں لگوانے رکھوانے کے علاوہ ایک اور کام وہ یہ بھی کرتے تھے کہ وہ کہتے کہ آدمی جب رات کو دیر تک لکھتا پڑھتا ہے تو اکثر بھوک لگ آتی ہے اسلئے کچھ بسکٹ، دال بیجی وغیرہ بھی میرے پاس رکھدیتے تھے، کچھ نوٹس لینے کے لئے سادہ کاغذ بھی رکھدیا کرتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ صاحب کتنی گہرائی سے وقت کی ضرورتوں کو سوچتے محسوس کرتے اور پھر ان کو فراہم کرتے ہیں!۔

آج ان باتوں کو نصف صدی سے اوپر گزر چکی ہے اس پورے عرصے میں نہ ان سے ملاقات، نہ فون، نہ کوئی خیر خبر لیکن دل ان کے احسان اور حسنِ سلوک کی یاد سے معمور ہے، میں نے نہ معلوم کتنی بار تنہائیوں میں ان کے لئے دعائیں کی ہیں۔

اُس وقت ان کی عمر ۴۵-۵۰ رسے کم نہ تھی خدا کرے وہ جہاں بھی ہوں اللہ کی رحمتوں سے فیض یاب رہیں، اِس دنیا میں ہوں یا اُس دنیا میں، بعد میں وہ سُنا ہے سیلم

سے چنئی منتقل ہو گئے تھے۔

احسان شناسی ہر انسان میں اچھی صفت ہے لیکن اس ناچیز میں یہ صفت عارضہ اور بیماری کی حد تک ہے میں کسی کے احسان کا بدلہ دے سکوں تو بہت اچھا ورنہ میں چاہوں نہ چاہوں وہ احسان مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے میں اسے بھلا دینے پر قادر ہی نہیں ہوں اور زیادہ کچھ نہیں تو میں اپنے محسنین کے لئے دعاء تو کرتا ہی ہوں، اور اللہ کے بدلہ دینے سے بڑھ کر اور کیا بدلہ ہو سکتا ہے!۔ آج کسی کو نہیں معلوم، یہاں دہلی میں تو خیر کیسے معلوم ہو گا سیلم اور خود مدرسہ مظاہر العلوم اور اُس وقت کے اساتذہ اور اسٹاف تک کو بھی شاید معلوم نہ ہو کہ وکیل محمود شریف کون تھے اور میرا ان کا کیا تعلق تھا مگر وہ اپنے اس احسان کی وجہ سے میرے دل میں مستقل بسے ہوئے ہیں جزاہ اللہ خیراً۔ ان کے بچوں سے کوئی تعارف نہیں تھا اللہ تعالیٰ ان کو بھی خوش رکھے۔ آمین

آدمی کی شخصیت کی تعمیر

انہی باتوں سے آپ سمجھئے کہ آدمی کی شخصیت کی تعمیر میں کن کن عوامل، کن کن معروف اور غیر معروف شخصیات اور کیسے کیسے بظاہر غیر متعلق احوال واسباب کا دخل ہوتا ہے ع

"سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے"

مدینہ اخبار (بجنور)

اس زمانے میں ہندوستان کا ایک عظیم اردو اخبار "مدینہ" جاری تھا اور میرے پاس وہ آیا کرتا تھا، جاری تو کیا تھا اسے مولوی مجید حسن مرحوم نے مگر اسوقت انکے صاحبزادے جناب سعید اختر صاحب مالک وایڈیٹر تھے ایک بار انھوں نے مجھ سے اخبار کے لئے کوئی

مضمون بھیجنے کو کہا، مجھے کوئی الگ مضمون لکھنے کا موقع نہیں تھا میں نے اپنی زیرِ ترتیب کتاب ''رمضان کیا ہے؟'' کا کوئی حصہ نقل کر کے بھیج دیا، انھوں نے بہت پسند کیا اور لکھا کہ ''آپ کو اللہ تعالیٰ نے اگر ایسا دل کش اور رواں اندازِ تحریر دیا ہے تو خوب لکھئے اور مدینہ اخبار کے صفحات آپ کے لئے حاضر ہیں''.

یہ اخبار کسی زمانے کا بڑا اور بہت نیک نام اخبار رہا ہے، اسکا پرانا وقفۂ اشاعت تو نہیں معلوم کیا تھا لیکن اُس زمانے میں وہ غالباً سہ روزہ تھا۔

ترجمۂ شیخ الہندؒ

سعودی حکومت کا شائع کردہ شیخ الہند کا ترجمہ مع تفسیر عثمانی جو آج ایشیا کے ہر مدرسہ میں اور تقریباً ہر مسجد اور بے شمار لوگوں کے پاس موجود ہے سب سے پہلے اسکو شائع کرنے والے مولوی مجید حسن مرحوم (م ۱۹۶۶ء) ہی تھے، انھوں نے اس کو اپنے مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا تھا، یہ قدیم نسخہ بھی ہمارے یہاں چمڑے کی جلد میں موجود تھا جو غالباً مولوی مجید حسن مرحوم نے والد صاحبؒ کو دیا تھا پھر سن ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں انکے فرزند جناب سعید اختر صاحب نے شائع کیا، انکا دیا ہوا نسخہ میرے پاس محفوظ ہے، اسکے بعد وہ اردو بازار دہلی سے بھی چھپا تھا۔ اس تیسری اشاعت تک کتابت وہی مولوی مجید حسن کی کرائی ہوئی تھی، اسی سے عکس لے لے کر چھاپا جارہا تھا، سعودی حکومت نے نئی کتابت کرائی اور سائز ذرا پہلے سے بڑا رکھا تھا۔ یہ سعودی اشاعت اس ترجمہ وتفسیر کی چوتھی اشاعت تھی۔

حکیم محمد احمد خیری مرحوم (علی گڈھ)

علی گڈھ کے حکیم محمد احمد خیری مرحوم میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملنے

والوں میں تھے ایک بار ۱۷ر جولائی سن ۱۹۷۰ء کو حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ علی گڑھ جانا ہوا، حکیم صاحب کے یہاں بھی حاضری ہوئی انھوں نے اپنی لائبریری دکھائی جسمیں ہر علم وفن کی بہت سی کتابیں تھیں انھوں نے مجھ سے فرمایا: مولوی صاحب! ان میں سے جو بھی کتاب آپ چاہیں اور جتنی چاہیں لے لیں، لیکن ظاہر ہے پہلی ہی ملاقات، زیادہ تعارف نہیں، کوئی کچھ دینے کو تیار ہو جائے تو ہوسنا کی کے ساتھ کسی کو لوٹ بھی تو نہیں سکتے، میں نے ایک حصن حصین کا قدیم نسخہ (مطبوعہ سن ۱۳۳۱ھ، مطبع یوسفی لکھنؤ) لیا اور ایک دو نحو وصرف کی عربی کتابیں۔ حکیم صاحبؒ کہنے لگے کہ کتابوں کے سلسلے میں مولوی کا پیٹ تو بہت بڑا ہوتا ہے آپ نے صرف دو تین ہی کتابوں پر اکتفا کرلیا؟ لیکن بات یہ تھی کہ کھڑے کھڑے میں کیا فیصلہ کرتا، لمبا وقت ملتا پوری لائبریری چھانتا تو انتخاب کرتا۔ بہرحال اس حِصنِ حصین نے اور اس کے مبسوط ومفصل حواشی نے مجھے بہت سے کاموں میں مدد دی جزاہ اللہ خیراً۔

کتاب کے سرورق پر اسی وقت میں نے ان کا نام اور عطیہ کی تاریخ لکھ دی تھی ورنہ ''حکیم خیری'' تو یاد تھا پورا نام اور تاریخ کہاں یاد رہتی۔

ندوۃ المصنّفین سے رابطہ

کتاب ''رمضان کیا ہے؟'' مکمل تو سلیم (تمل ناڈو) ہی میں ہوگئی تھی، لیکن میں پھر دہلی واپس آگیا اور طباعت اس کی دہلی میں ہوئی، اس کی طبع اول پر تاریخ شوال سن ۱۳۸۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۹ء درج ہے۔ چھپنے کے بعد بعض اخبارات ورسائل کو تبصرے کے لئے جو بھیجی گئی ان میں رسالہ برہان کو بھی بھیجی جو اس وقت صفِ اول کا ماہانہ اردو رسالہ اور ندوۃ المصنفین، دہلی کا ترجمان (آرگن) تھا۔

تبصرے برہان میں اس کے مدیر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم لکھتے تھے اور کبھی وہ کسی اور سے بھی لکھواتے تھے لیکن مفتی عتیق الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اکثر کتابوں پر نظر ضرور ڈالتے تھے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

انھوں نے رمضان کیا ہے کو بھی دیکھا، اسمیں حوالوں کا انداز، زبان کی کیفیت، موضوع کا احاطہ وغیرہ دیکھا، شروع میں انتساب دیکھا جو میں نے اپنے والد صاحبؒ کے نام کیا تھا۔ والد صاحبؒ کا حضرت مفتی صاحبؒ کا پرانا اور قریبی تعلق تھا، مفتی صاحبؒ نے والد صاحبؒ سے پوچھا کہ ''یہ آپ کے صاحبزادے ہیں؟'' انھوں نے ہاں میں جواب دیا تو فرمایا: ان سے کہئے کہ مجھ سے مل لیں، میں ملا تو کتاب کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ میرے پاس ایک کام ہے جو میں نے مولوی عاشق الٰہی بلند شہریؒ کو دیا تھا لیکن وہ چند صفحات ہی لکھ سکے تھے دہلی سے ان کا جانا ہو گیا وہ کام میں آپ کو دینا چاہتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ میں تھوڑا سا کام کر کے آپ کو دکھا دوں گا آپ پسند فرمائیں گے تو میں کروں گا ان شاء اللہ۔

مفتی صاحبؒ نے فرمایا دکھانے کی ضرورت نہیں ہم نے آپ کی کتاب دیکھ لی ہے آپ یہ کام ٹھیک سے کرلیں گے۔ اور پھر وہ کام انھوں میرے حوالے کر دیا، فرسٹ فلور پر کمرہ بتا دیا کہ آپ یہاں بیٹھا کریں۔ اس وقت میرے والد گرامیؒ نے مجھے جو نصیحت فرمائی تھی وہ بتانا بھی ضروری ہے، نوجوان عزیزوں کے لئے اسمیں بڑا سبق ہے، انھوں نے فرمایا تھا کہ ''ادارے سے تمہیں کیا یافت ہو رہی ہے اسکو نہ دیکھنا یہاں سے وابستگی اور ان حضرات کی رفاقت تمہارے مستقبل کے لئے بہتر ہوگی ان شاء اللہ''۔

مجھے اس نصیحت سے بہت فائدہ ہوا، ندوۃ المصنفین کا ماحول، مفتی صاحبؒ سے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ سے ملاقاتوں اور وہاں کی لائبریری کا میری شخصیت کی تعمیر میں۔جیسی بھی کچھ بُری بھلی تعمیر ہوئی۔اہم حصہ ہے۔وہاں سے ایک کامیاب بلند پایہ ماہانہ رسالہ ''برہان'' نکلتا تھا اسمیں لکھنے کا بھی موقع ملتا تھا، اسمیں میرے تبصرے بھی چھپتے تھے۔

وہ کام جو مفتی صاحبؒ نے میرے سپرد کیا وہ حافظ زکی الدین عبدالعظیم المنذری (م۶۵۶ھ-۱۲۵۹ء) کی کتاب الترغیب والترہیب کا انتخاب، ترجمہ اور تشریح تھا، چنانچہ الحمدللہ اسکی پہلی جلد ندوۃ المصنفین (جامع مسجد دہلی ۶) سے سن ۱۳۹۳ھ-۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی اور وقفے وقفے سے چار جلدیں چھپیں، پانچویں کی آفسیٹ کی کتابت مکمل ہو چکی تھی چھٹی کا کافی حصہ ترتیب پا چکا تھا کہ:

''آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند''

ندوۃ المصنّفین کا خاتمہ

مفتی صاحب کا سن ۱۹۸۴ء میں انتقال ہو گیا اور اسی کے ساتھ ندوۃ المصنفین کے سب کام رک گئے۔اور رُک ہی نہیں گئے بلکہ جو بات میرا قلم لکھنے کو راضی نہیں وہ سچائی ہزار حسرت و مایوسی کے ساتھ لکھنے پر مجبور ہوں کہ ندوۃ المصنّفین وفات پا گیا، وہ ندوۃ المصنّفین جس نے مجھے رفتار دی، جس نے مجھے وقار و اعتبار دیا، جس نے میرے مطالعے کے لئے ہر فن کی چنیدہ کتابیں دیں، جس نے میرے ذہن کو جلا بخشی، جس نے مجھے جراَتِ اظہارِ رائے بخشی، مجھے قلم کی بے خوف روانی بخشی اور میں کیا کیا بتاؤں کہ روزانہ صرف چند گھنٹوں کی رفاقت نے مجھے کیا کیا بخشا، واحسرتا کہ وہ فنا ہو گیا اور پھر کچھ عرصے بعد اس کا قیمتی ذخیرۂ کتب جامعہ ہمدرد (تغلق آباد، دہلی) منتقل ہو گیا اور اس کے

بعد دفتر کی عمارت بھی فروخت ہوگئی، ارباب علم ودانش کے لئے یہ حادثہ اس حادثے سے کم نہیں ہے جس پر کہا گیا تھا :

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں
برزوال ملکِ مستعصم امیر المؤمنیں

اللہ تعالیٰ ہمیں اسکا نعم البدل عطا فرمائے۔آمین

میرے یہ خیالات میرے ایک فاضل دوست نے سنے تو وہ کہنے لگے کہ آپ تو وہاں بنے بنائے آئے تھے تبھی تو انھوں نے آپ کو رفیق بنایا تھا! میں نے کہا کہ محترم! میں اُدھ بنا اور اُدھ چنا آیا تھا، مین زیرِ تکمیل تھا اس ادارے نے، اس ماحول اور اس در و دیوار نے میری تکمیل میں مدد دی، مجھے حوصلہ بخشا مجھے مزاحمتوں سے ٹکرانا اور پھر سرخرو نکل آنا سکھایا۔

ہواؤں سے الجھو ، تلاطم سے کھیلو
کہاں تک چلوگے کنارے کنارے

ندوۃ المصنفین کیا ہے؟ اور اسکی خدمات کیا ہیں؟ یہ جاننے کے لئے تو ندوۃ المصنفین پر لکھی گئی مستقل کتاب اور برہان کا مفکر ملت نمبر دیکھنا چاہیے میں تو ان صفحات میں ندوۃ المصنفین سے اپنے تعلق کی تھوڑی سی داستان اور حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں صرف اپنے تأثرات لکھوں گا۔

ہندوستان (غیر منقسم عظیم ہندوستان) کے یہ دو ادارے دار المصنفین اعظم گڈھ اور ندوۃ المصنفین دہلی ایسے معیاری ادارے ہیں جو بہت با مقصد، نئی اور مفید کتابیں شائع کرنے کے لئے قائم کئے گئے تھے، کتابیں ظاہر ہے فروخت ہوتی تھیں لیکن کتابوں سے کاروبار کرنا ان کا مقصد کبھی نہیں رہا، اور ان دونوں ہی نے تصنیف وتالیف کا ایک اعلی اور

منفرد معیار قائم کیا، دار المصنفین نے زیادہ تر تاریخ وسوانح پر توجہ دی لیکن ندوۃ المصنفین کا دائرہ بہت وسیع تھا، انداز دونوں کا تقریباً یکساں تھا۔ تصنیف وتالیف کا ڈھنگ روز اول سے میں نے انہی اداروں کی کتابوں سے لیا تھا۔

ان کے مستقل مصنفین جوان کے مقررہ انداز پر اور انہی کی تحریک پر لکھتے ہیں ان کو یہ ''رفیق ادارہ'' کہتے اور لکھتے ہیں، غیر رفقاء کی کتابیں بھی انکے یہاں سے چھپی ہیں لیکن ان کا معیار انھوں نے ضرور دیکھا پرکھا ہے، کوئی غیر معیاری کتاب کبھی شائع نہیں کی۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ اور مولانا بدر عالم میرٹھیؒ یہ لوگ اور ایسے بڑے اہل علم اس ادارے کے اہل قلم اور رفقاء رہے ہیں، اسی لئے سن ۱۹۷۳ء میں جب انتخاب الترغیب کی پہلی جلد آئی اور اس پر میرے نام کے ساتھ ''رفیق ندوۃ المصنفین'' چھپا تو دہلی کے اس وقت کے بہت سے علماء نے مجھے اس بات پر خصوصی مبارک باد دی تھی کہ آپ اس ادارے کی تاریخ میں سب سے کم عمر ''رفیق ندوۃ المصنفین'' ہیں۔ والحمدللہ علی ذلک۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں مذکورہ مفکر ملت نمبر میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو نومبر سن ۱۹۸۷ء میں ۵۵۹ صفحات پر مشتمل چھپ چکا ہے۔

مفتی صاحبؒ کی بالغ نظری

حضرت مفتی صاحبؒ کی خاص بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر معاملے کو پرکھنے کی ایک خاص نگاہ دی تھی، عالم بہت سے حضرات ہوتے ہیں، علوم شریعت پر وسیع نظر بہت سے حضرات کو بخشی جاتی ہے لیکن یہ خاص نگاہ کم لوگوں کو ملا کرتی ہے۔ حضرت قاری طیب صاحبؒ کوئی معمولی ہستی نہیں تھے لیکن دار العلوم کے معاملات میں ان سے جو

بعض فروگزاشتیں اور بعض فیصلوں میں دوراندیشی کی کمی ہوئی اس پر (مجھے یاد ہے میں اسوقت ندوۃ المصنفین کے دفتر ہی میں تھا) مفتی صاحبؒ قاری صاحبؒ کولیکر اپنے بڑے کمرے میں اندر بیٹھے ہوئے تھے اور دارالعلوم کے انتظامات پر بات چیت ہورہی تھی بات تو لمبی تھی اور راز دارانہ تھی میں دوسرے کمرے میں تھا مگر کوئی کوئی لفظ جوش میں بلند آواز سے نکل جاتا تھا جو بغیر کسی کوشش اور بغیر تجسس کے میرے کان میں پڑجاتا تھا، اس سے اندازہ ہورہا تھا کہ مفتی صاحبؒ جیسے قاری صاحبؒ کو ڈانٹ رہے ہوں کہ ''ایسی کیا جلدی تھی کچھ دن صبر کرلیتے، بس آپ کو تو بے چینی تھی کہ کسی طرح جلدی سے جلدی سالم کو سب تام جھام سونپ دوں''۔

مفتی صاحبؒ سے شاید عمر میں قاری طیب صاحبؒ زیادہ ہی ہونگے یا برابر ہونگے مگر مفتی صاحب انکو اس طرح ہمدردانہ اور مشفقانہ انداز میں ڈانٹ رہے تھے جیسے کوئی بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی سرزنش کرتا ہے اور قاری صاحبؒ معذرت خواہی کررہے تھے یا خاموش سن رہے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ میں ان کی امتیازی شان

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے مفتی صاحبؒ بہت پرانے ممبر تھے اور ہمیشہ پابندی سے شریک ہوتے تھے، بسا اوقات بعض لوگ کسی کمیٹی کے ممبر یا کسی شوری کے رکن کسی کے کہنے پر بنالیے جاتے ہیں، کبھی علاقے کے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان کا ایک آدمی لینا مناسب ہوتا ہے اسلئے لے لیا جاتا ہے چاہے وہ معاملہ فہم اور اس کام کے لئے پوری طرح موزوں نہ ہو، ظاہر ہے وہ صرف خاموش بیٹھا رہتا ہے، یہ تنظیموں اور اداروں کی اپنی مصلحتیں ہوا کرتی ہیں۔

لیکن مفتی صاحب کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی غضب کی تھی، وہ جو کہا جاتا ہے ''اُڑتی چڑیا کے پر گن لینا'' ان کا معاملہ ایسا ہی تھا، عرب شاعر اوس بن حجر کہتا ہے۔

الألمعي الذي يظن بک الظن = كأنْ قد رأى وقد سمعَا

''ذکی اور ذہین، صاحبِ فراست آدمی جب تمہارے بارے میں گمان اور اندازے سے کچھ کہے تو وہ ایسا ہوتا ہے (اتنا درست ہوتا ہے) جیسے اس نے دیکھ اور سن رکھا ہو'' مفتی صاحب جس معاملے میں رائے دیتے وہ ایسی ہی ہوتی تھی کہ وہ گویا مستقبل کو کھلی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ بہت سے معاملات میں ایسا ہوا کہ مفتی صاحب کی یا ان کے ساتھ کسی ایک دو شخص کی رائے کسی معاملے میں ایک تھی لیکن اکثر ارکان کی رائے دوسری تھی اسلئے کثرتِ رائے پر فیصلہ کر دینا ہی مجبوری تھی، ایسے مواقع پر مفتی صاحبؒ فرماتے کہ کثرت رائے اس طرف ہے مجھے بھی تسلیم ہے مگر رجسٹر پر فیصلے کے ساتھ میرا اختلافی نوٹ بھی لکھا جائے۔ چنانچہ وہ لکھدیا جاتا۔

پھر جب اس فیصلے کے نقصانات سامنے آتے اور ان پر گفتگو ہوتی تو مفتی صاحبؒ فرماتے کہ اب وہ رجسٹر نکالئے اور اس میں دیکھئے میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔

چنانچہ ایک مرتبہ کسی مدرس کے تقرر کا مسئلہ شوریٰ میں آیا، موافق مخالف رائیں آئیں اکثریت تقرر کرنے کی طرف تھی، مگر مفتی صاحبؒ کی رائے تقرر کرنے کی نہ تھی بلکہ مخالفت میں تھی۔ بہر حال کثرت رائے سے تقرر کر لیا گیا۔ مفتی صاحبؒ نے اپنا اختلافی نوٹ درج کرایا۔

کچھ عرصے کے بعد ان صاحب نے کچھ غلط حرکتیں شروع کیں، وہ شکایتیں اہتمام میں پہنچیں، اس کے بعد جو شوریٰ کا اجلاس ہوا تو دیگر مسائل کے ساتھ یہ مسئلہ بھی رکھا گیا، مفتی صاحبؒ نے فرمایا، ان کے تقرر کے وقت جو شوری ہوئی تھی وہ رجسٹر نکالا جائے، وہ

دیکھا گیا تو اس میں مفتی صاحب کا اختلافی نوٹ تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور راہ راست پر رکھے کبھی کبھی ہوتا یہ ہے کہ کمیٹی کے ممبران یا مجلس شوریٰ کے ارکان کو کسی خاص مقصد کے تحت پہلے سے سیٹ کرلیا جاتا ہے اور کثرت رائے کا فائدہ اٹھالیا جاتا ہے۔ واللہ اَعلم۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کئی کئی صحابہ کرامؓ سے متعدد محدثین نے نقل کیا ہے کہ المستشار مؤتمن ''جس سے مشورہ لیا جائے اسکو امانت دار (غیر جانب دار اور مخلص) ہونا چاہئے۔'' (الجامع الصغیر ۶/ ۲۶۸)

محترم قارئین! جو اصل معاملے کی ہمدردی اور خیر خواہی کے علاوہ کسی اور مقصد کو سامنے رکھ کر بول رہا ہے وہ خیانت کر رہا ہے۔

الفاظ کے ذریعہ ذہن میں اتر جانا

ذہین آدمی سامنے والے کی بات کو سنکر اسکے لفظوں کو کمند بنا کر ان کے ذریعے اسکے ذہن و دماغ میں اتر جاتا ہے اور وہاں جا کر سب کچھ دیکھ لیتا ہے کہ وہاں کیا کیا ہے۔ موقع ہوتا ہے اظہار کر دیتا ہے ورنہ سمجھ کر اسکے مطابق احتیاطی تدبیریں کر لیتا ہے۔

رمز آشنائے عصر

ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں آپ حیران ہونگے ملک کے ایک مشہور و معروف عالم، شیخ وقت اور پیر یوپی سے دہلی آئے ہوئے تھے، میری بھی ان سے نیازمندی تھی میں انکے پاس موجود تھا کہ مفتی عتیق الرحمن صاحبؒ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ دونوں ان سے ملاقات کو آگئے، اُن صاحب کو میرا مفتی صاحب سے قریب ہونا بھی معلوم تھا۔ دعاء

سلام کے بعد چائے وغیرہ کے لئے ان بزرگ نے مجھ سے کہا کہ ان کے لئے میں دسترخوان لگواؤں، میں نے دسترخوان لگوایا، جب چائے چل رہی تھی تو اُن صاحب نے کسی کومخاطب کر کے کہا:

''یہ مفتی جی بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں بس ذرا تھوڑا ساذکر وشغل اور کرنے لگیں۔''

اسوقت تو مفتی صاحبؒ نے ہنس کر بس اتنا کہہ دیا کہ ''جی ی ی۔۔۔ہاں ں! سب لوگ ایک ہی کام کرنے لگیں۔''

لیکن اگلے دن جب میں ندوۃ المصنفین پہنچا اور مفتی صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ''مولوی صاحب! آپ سمجھے کل مولوی ''فلاں'' کیا کہہ رہے تھے؟''

پھر اس سوال کو یہیں چھوڑ کر فرمایا: ''جی ہاں!! یہ بھی عجیب شوق ہے کہ ساری دنیا ہماری مرید ہوجائے'' (ناظرین! اس جملے نے میرے دماغ کے دریچے کھول دیے، مفتی صاحبؒ نے کتنی ساری داستانیں کہہ ڈالیں، انسانی نفسیات کی کتنی پرتیں کھول دیں اور مردم شناسی کے کتنے سارے سبق پڑھادئے) کیا مطلب؟ جی ہاں! اسکا مطلب یہ ہے کہ مفتی صاحب عمر کے اس مرحلے میں پہنچنے کے بعد اب اگر ذکر وشغل کی طرف توجہ کریں گے تو اور کون بچا ہے جس سے وہ رجوع کریں گے!، لامحالہ اسی آستانے پر توجہ سائی کریں گے!۔

مجھے جب بھی اس بات کا خیال آتا ہے تو دل ہی دل میں حضرت مفتی صاحبؒ کی زیرکی، سخن فہمی اور جزرسی کی داد دیتا ہوں۔ مجھے اس زمانے میں ایسی باتیں سن کر زمانہ شناسی اور طبائع شناسی کا سبق ملتا تھا اور مختلف شخصیتوں کے انتقاد (پرکھنے) کا موقع ملتا تھا کہ ع

''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ''

کہا جارہا ہے کچھ، اور سوچا جارہا ہے کچھ اور۔ میں دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ طالب علم مدارس اور کتابوں سے جڑی بوٹیاں (عقاقیر یعنی ادویۂ مفردہ) فراہم کرتا ہے

لیکن ان کا موقع استعمال جاننا اس سے زیادہ بڑا علم ہے، اور وہ چیز مفتی صاحب جیسے زیرک، زمانہ شناس اور عبقری لوگوں سے ملا کرتی ہے۔ جزاہ اللہ خیراً۔ اور ایسے لوگ کم ہوتے ہیں، میں اللہ کا جتنا شکر کروں کم ہے کہ اُس نے ایسی ہستی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع دیا ع

''ہاں! مری چشم گنہگار نے یہ بھی دیکھا''

میں اگر ان چیزوں کو جمع کرنا چاہوں تو یکجا نہیں کر سکتا لیکن ان کی ملاقاتوں سے ایک ذہن بننے میں مدد ملی جو ہر قدم پر کام دیتا ہے، مفتی صاحب کا آشیاں اسقدر اونچی قطب مینار پر تھا کہ وہاں سے دور تک کا نظر بھی آتا تھا اور ہر چیز چھوٹی بھی نظر آتی تھی، جہاں عظیم لوگوں کی عظمتیں زیادہ مرعوب نہیں کرتیں، بُرے لوگوں کی برائیاں زیادہ پریشان نہیں کرتیں، مخالف نقطۂ نظر پر بہت زیادہ جھنجلاہٹ نہیں آتی، اپنوں کے لئے بہت زیادہ تعصب اور غیروں سے بہت زیادہ دوریاں نہیں رہتیں، وہ ایک الگ منزل ہوتی ہے، ہاں ان باتوں کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ آدمی اپنی کیلی پر مضبوط اور پختہ بھی ہو جسکو کہا گیا ہے لاتکونوا اِمَعۃً (بے رائے کے نہ بن جاؤ) یعنی ڈھل مُل اور بے پیندیے نہ ہو جایئے۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بَگِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے

مشترک قومی تہذیب میں جینے کا ہنر

مفتی صاحبؒ کی ایک عجیب خوبی یہ تھی کہ ہندوستان میں جو ایک مشترک قومی تہذیب ہے اور غیر مذہب والے لوگوں کے ساتھ ایک مسلمان رہتا ہے وہ اپنے اسلام پر قائم رہتے ہوئے کس طرح حالات سے ہم آہنگ ہو؟ اکثریت کے ساتھ رہ کر دودھ میں

پڑی شکر کی طرح وہ گھل بھی نہ جائیں اور اُن سے لڑبھڑ بھی نہ جائیں، ان سے ٹکراؤ بھی نہ ہو اور اپنی انفرادیت پر بھی آنچ نہ آئے یہ توازن مفتی صاحب کے یہاں بڑی خوبی سے موجود تھا۔ اور نہ صرف موجود تھا بلکہ اسکو وہ پیش بھی بڑے سلیقے سے کرتے تھے۔

اسی طرح مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے ساتھ توافق وہم آہنگی، انکے ساتھ رواداری جو ضروری ہے جسکی بہت کچھ وضاحت میں نے اپنے پانچ چھوٹے چھوٹے رسائل میں کی ہے: (۱) اتحادِ ملت (۲) مسلک کا فرق اور ملی اتحاد (۳) عصبیت کے سائے اور نورِ ہدایت (۴) عظمتِ مومن اور (۵) ملت اسلامیہ اور فرقہ بندی کی زنجیریں۔ مفتی صاحب اس رواداری کا بہترین نمونہ تھے۔

ملی حالات سے باخبر حضرات جانتے ہیں کہ ہمارے بعض حضرات مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی سے کس قدر دور ونفور ہیں، بعض بھائی ہیں جو دیوبندیت و بریلویت میں سے کسی ایک خانے میں گوشہ گیر ہیں، شیعیت وسنیت میں ایک بڑی اور گہری کھائی بنائے رکھنے کو فکری مضبوطی اور دینی تصلّب وپختگی کی علامت بنائے ہوئے ہیں، کسی دیگر مکتب خیال کے افراد سے ملنا جلنا اور معاشرتی تعلقات بنانا تک اپنے مسلک میں کچائی اور کمزوری کی علامت سمجھتے ہیں۔ کل حِزب بمالدیھم فرحون۔

اس پہلو سے مفتی عتیق الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو آپ دیکھیں گے تو سمندر کی وسعت اور نسیم صبح کے خوشگوار جھونکے کی راحت محسوس کریں گے۔ انکے یہاں جماعت اسلامی کے اخبار ''دعوت'' کے ایڈیٹر محمد مسلم صاحب مرحوم بھی بار بار آتے صلاح ومشورہ رکھتے تھے باہمی اعتماد بھی تھا، بوہروں کے نمایاں حضرات بھی آتے ان سے اپنایت و یگانگت سے ملتے دہلی کے اکثر مدارس کے وہ سرپرست تھے، یہی معاملہ ملت کے دیگر طبقات کے ساتھ بھی تھا۔

بیمن عشق زکونین صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

(یعنی عشق کی برکت ہے کہ ہم نے ہر دو جہاں سے صلح کرلی ہے (اور اے مخاطب! یقین نہ آئے تو) تو ہمارا دشمن بن جا اور پھر ہماری دوستی کا تماشا دیکھ لے)

انکی ریڈیائی تقریریں جو محترم ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب مرحوم (وفات یکم فروری ۲۰۰۴ء) نے ''منارصدا'' کے نام سے ۲۷۸ رصفحات پر مشتمل سن 1981ء میں مرتب کی ہیں ایک الگ ہی نمونہ پیش کرتی ہیں جن میں رسول اکرم ﷺ کی انسان دوستی، خلق محمدی، شہید اعظم حضرت حسینؓ پر تقریر ہے جن میں بہت مناسب لچک اور رواداری موجود ہے اور یہ ''لچک'' ''کمزوری'' کی نہیں پختگی اور مضبوطی کی علامت ہے۔ جن لوگوں کو ریڈیو، ٹیلی ویژن پر یا کہیں مشترک مجمع میں جہاں مخلوط مجمع ہو خطاب کرنے کی نوبت آتی ہے ان کے لئے اسمیں اپنی بات پیش کرنے کا اچھا ڈھنگ معلوم ہوگا۔

میں مفتی صاحبؒ کو مدارس اور طلبہ کی اصطلاح کے لحاظ سے اپنا ''استاذ'' چاہے نہ کہہ سکوں لیکن وہ کئی اساتذہ سے بڑھ کر میرے استاد ہیں، میں نے ان سے کیا کیا سیکھا میں بیان نہیں کرسکتا۔ غَفَرَ اللہُ لہٗ و رَحِمَہٗ۔

مولوی ظفر احمد خاں مرحوم

ماہنامہ برہان جو ندوۃ المصنفین دہلی کا ترجمان ماہانہ رسالہ تھا اس کے منیجر مولوی ظفر احمد خاں شاہ جہاں پوری مرحوم تھے، سن ستر بہتر ہی میں وہ ستر بہتر کے تھے، معلوم ہوا ہے کہ سن ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کو کتابت، طباعت، پروف ریڈنگ اور پریس وغیرہ کا بڑا اچھا تجربہ تھا، ہم نے مسودہ تیار کرنے سے لے کر مجلد

کتاب ہاتھ میں آنے تک کے درمیان کے بہت سے مراحل کے نشیب و فراز، ان کی دشواریاں اور ان کی نزاکتیں اور احتیاطیں ان سے سیکھیں، مسودہ ہمیشہ کاغذ کے ایک ہی رخ پر تیار کرنا یہ بھی شاید انہی سے سیکھا تھا، کفایت شعاری کے شوق میں آکر کاغذ کے دونوں رخ استعمال کر لئے جائیں تو کبھی جب مسودے کا کچھ حصہ تبدیل یا ضائع کرنا پڑے گا یا کسی ضرورت سے کاٹنا پڑے گا تو دوسرا رخ بھی خواہ مخواہ کٹ جائے گا، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

پروف ریڈنگ کا تجربہ

انکے ساتھ بیٹھ کر پروف ریڈنگ کرانا ہماری ذمہ داری کا حصہ تو نہیں تھا لیکن کبھی کبھی ان کے ساتھ اس کام کے لئے بیٹھنا ہوتا تھا تو ہمیں اپنی عمر کے اس ابتدائی دور میں اس عمل کو سیکھنے کا اچھا موقع ملتا تھا، تجربہ یہ ہوا کہ آپ کتابت شدہ (کمپوز شدہ) مضمون یا کتاب کو خواہ کتنی ہی توجہ اور باریک بینی سے دیکھ چکے ہوں لیکن ایک بار کا دیکھنا کافی نہیں ہوتا، پھر کاتب (کمپوزیٹر) سے غلطیاں بنوانے کے بعد لازماً۔ جی ہاں لازماً۔ چیک کرنا ضروری ہے ورنہ بسا اوقات کئی کئی اشاروں میں سے کسی اشارے سے اس کی نظر چوک جاتی ہے یعنی بعض اغلاط درست ہونے سے رہ جاتی ہیں اور کبھی ایک عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ وہ غلطی درست کرنے کے دوران ایک دوسری غلطی کر دیتا ہے، اسلئے بڑی بیدار مغزی اور چوکنے پن کی ضرورت ہوتی ہے، غلطیاں درست کرانے کے بعد پھر دیکھئے کہ غلطیاں بن بھی گئیں یا نہیں؟

آپ کے مضمون میں اگر اوپر تلے دو سطروں میں ایک جیسے الفاظ آگئے ہیں تو یقین کیجئے کہ کاتب (کمپوزیٹر) لازماً ایک سطر غائب کر دے گا۔ میں مسودہ تیار کرتے

وقت ایسی صورتِ حال پیدا نہیں ہونے دیتا خواہ اخیر سطر کا وہ لفظ کاٹ کر دوبارہ اگلی سطر میں لکھنا پڑے، یا پورا صفحہ لکھنے کے بعد ایسا لفظ نظر آیا تو میں نے دونوں سطروں کے سامنے سرخ لکیر کھینچ دی یا مزید یہ بھی دائرے میں لکھ دیا کہ ہوشیار!۔

ملتے جلتے ناموں میں کاتب اور کمپوزیٹر دھوکا کھا سکتا ہے ''ابو حَیّان'' اور ''ابن حِبّان'' کی کتابت میں ''طحاوی'' اور ''طحطاوی'' میں، نجاری (ن ج سے) بخاری (ب خ سے) یہ غلطی ہمیشہ ہوتی ہے۔

یہ چند وہ چیزیں ہیں کہ ان کا خیال رکھنا مصحح (پروف ریڈر) اور مصنّف و ناشر (پبلشر) کے لئے ضروری ہے۔

تحریر میں جو چیزیں بہت عام آسان اور ہمیشہ آتی ہیں ان پر توجّہ کم ہوتی ہے۔

ایک واقعہ

میرے ایک دوست جو ہر چھوٹی بڑی تحریر چھپنے سے پہلے مجھے ضرور دکھاتے تھے۔ایک مرتبہ انھوں نے لیٹر ہیڈ چھپوایا، میں دہلی سے باہر تھا، انھوں نے فون پر بتایا کہ وہ کمپوز ہو گیا ہے۔ میں چھپنے کو دے رہا ہوں، میں نے کہا ٹھہریئے میں کل آ رہا ہوں ان شاء اللہ۔ وہ بولے کہ اس میں زیادہ مضمون تھوڑی ہے۔ میں نے بھی دیکھ لیا ہے، کمپوزیٹر نے خود بھی اچھی طرح دیکھ لیا ہے، میں نے کہا چلئے چھپوا لیجئے۔ وہ چھپ گیا۔

بعد میں انھوں نے مجھے دکھایا، میں نے دیکھ کر کہا کہ اس میں غلطی ہے اور سنگین غلطی ہے۔آپ پھر دیکھئے اور اب بتایئے کہ کہاں ہے؟ انھوں نے بغور دیکھا، بولے نہیں ہے۔میں نے کہا کہ پھر بار بار دیکھ لیجئے! غلطی ہے، ان کو نہیں ملی۔

میں نے بسم اللہ کے اخیر لفظ پر انگلی رکھی اور پوچھا کہ اس میں 'رحیم' کی 'ر' کہاں

ہے؟ ناظرین محترم! وہاں 'الحیم' لکھا ہوا تھا۔ وہ بے اختیار بولے ''جائے استاد خالی ست'' (استاد کی جگہ خالی ہے)۔

اس میں بے پرواہی کا انجام

کتاب چھپنے کے بعد آپ کاتب یا کمپوزیٹر کو کوسیں اور اسے الزام دیں تو یہ غلط ہے ذمہ دار ہرگز وہ نہیں ہے پروف ریڈر اور اس سے اوپر پبلشر اور مصنف ذمہ دار ہے، آپ اپنے معصوم بچے کو کام والی بے علم اور لاپرواہ ملازمہ کو سپرد کر کے بے فکر کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ کا مضمون اور آپ کی کتاب ''آپ کی معصوم و بے زبان اولاد'' ہے اسکا پالنا پوسنا آپ کی ذمہ داری ہے نہ کہ کسی کم علم کمپوزیٹر یا بے پرواہ پروف ریڈر کی۔ میری آنکھوں نے زندگی میں ایسا حال بھی دیکھا ہے کہ ایک ادارے کو تقریباً پانچ سو پیج کی کتاب کا دس ہزار کاپیوں کا پورا ذخیرہ رد ّی والے کو تُلوانا پڑا تھا۔

چھپنے کے بعد کتاب کے اخیر میں ''اغلاط نامہ'' چھاپ کر لگا دینا بھی اسکا حل نہیں ہے یہ غلط طریقہ ہے، میں نے دیکھا ہے اکثر لوگ نہ اس غلط نامے کو دیکھتے ہیں اور نہ اسکی مدد سے اپنی کتاب کی تصحیح کرتے ہیں ہاں! کوئی راستہ نہ ہو تو مجبوراً اغلاط نامہ دیا جا سکتا ہے۔ جس کتاب کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے اسمیں غلطیاں اتنی زیادہ تھیں کہ اغلاط نامہ اسکے لئے مفید نہ تھا۔

''چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی''

جس لیٹر ہیڈ کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے وہ پورا ڈھائی سو یا پانچ سو پیج کا لیٹر ہیڈ ان کو ضائع کرنا پڑا تھا یا رف کاموں میں لینا پڑا تھا۔

دسمبر ۱۹۸۹ء میں اتحاد ملت سیریز کے کتابچوں کی کتابت دستی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک کے پیش لفظ کے اخیر میں جہاں میں نے پتہ لکھا تھا کاتب نے نئی دہلی

نمبر ۱۰۰۰۱۳ اکردیا تھا، یہ چیز عام طور پر بے توجہی کا شکار ہوجاتی ہے، میں نے ایک زیرد کم کرایا۔

دستی کتابت کے برخلاف کمپیوٹر کی کتابت میں یہ آسانی ہے کہ اگر عربی کی ایک عبارت کمپوزیٹر نے فارسی رسم الخط (نستعلیق) میں لکھ دی ہے اور آپ ہدایت دیں تو ایک بٹن دبانے پر وہ عربی رسم الخط (نسخ) میں تبدیل ہوجائے گی، البتہ اسمیں جگہ ذرا زیادہ درکار ہوتی ہے اسکا حل بھی ہے کہ خط ذرا ہلکا کردیا جائے۔

اسی طرح ایک بڑی سہولت یہ ہے کہ کاتب تو یہ کرجاتا تھا کہ نقطے پورے لگادیے شوشے کم بنائے، مثال کے طور پر لفظ ''چیلنج'' لکھا ہے، کاتب نے نقطے تو پورے سات عدد درست جگہوں پر لگادئے لیکن لام سے پہلے کا یا بعد کا ایک شوشہ بے خیالی میں رہ گیا۔ یہ کام کمپیوٹر نہیں کرتا، اسکے حساب میں ہر نقطہ کسی نہ کسی حرف اور شوشے کا ہے وہ بغیر شوشے کے نقطہ لگائے گا ہی نہیں۔ دوسری کوئی بھول کمپوزیٹر کرسکتا ہے، اس طرح کی بھول نہیں ہوگی۔

ہم نے مولوی ظفر صاحب مرحوم سے ہی یہ سیکھا ہے کہ جہاں کاتب (کمپوزیٹر) کے نہ سمجھنے کا اندیشہ ہو مثلاً جو لفظ آپ بنوا رہے ہیں اسمیں اور جو کچھ اس نے لکھا ہے اسمیں فرق واضح نہیں ہے تو درست لفظ لکھ کر اس کے برابر میں وہ الگ الگ حروف بھی لکھدیا کرتے تھے۔ مثلاً جو لفظ ہم نے اوپر لکھا ہے اسمیں اگر غلطی ہوتی تو وہ اسکو درست لکھنے کے بعد علیحدہ حروف میں۔ چ ے ل ن ج۔ بھی لکھ دیتے تھے۔ میں نے اس میں ایک اور اضافہ کیا ہے کہ جہاں پھر بھی اس کے نہ سمجھنے کا اندیشہ ہو تو میں الگ الگ حروف لکھنے کے بعد یہ بھی وضاحت گول دائرے میں کردیتا ہوں (پانچ حروف) مثلاً عربی اسلامی مصنفین میں ایک محدث طحاویؒ ہیں اور ایک فقیہ طحطاویؒ ہیں، پہلے بزرگ زیادہ معروف ہیں، میری کسی تحریر میں جب بھی کبھی یہ دوسرے مصنف آئے۔ میں نے مسودے کے کنارے پر

الگ الگ حروف لکھ دیۓ اور ایک آدھ بار اس کے باوجود کمپوزیٹر نے غلطی کی اور مجھے اسے اشارہ دینا پڑا کہ ''ط ح ط اوی (چھ حروف)''۔

یعنی آپ کو خود ہی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ سامنے والا کہاں اور کیا غلطی کر سکتا ہے اسکی پیش بندی آپ پہلے ہی سے کر دیجئے ـــــ یہ باتیں شروع شروع میں ہم نے مولوی ظفر صاحب مرحوم ہی سے سیکھیں، بعد میں تو آدمی کا تجربہ اور راہ کی ٹھوکریں بھی بہت کچھ سکھا دیتی ہیں جزاہ اللہ خیراً۔

کٹنگ پیسٹنگ

ایک مصنف، مضمون نگار کو (اگر وہ کمپیوٹر پر نہیں کاغذ پر مسودہ تیار کر رہا ہے جیسا کہ میں کرتا ہوں) بسا اوقات بے خیالی میں غلط لکھے جانے یا بعد میں یاد آئی کوئی بات مضمون میں شامل کرنے کے لئے کٹنگ پیسٹنگ سے مدد مل جاتی ہے، بار بار پورا مسودہ آپ دوبارہ لکھیں اس سے اچھا ہے کہ غلط لکھی عبارت پر کاغذ چپکا دیں، لیکن یاد رہے کہ بعد میں جو لکھنا ہے اسے پہلے لکھ لیں ورنہ وہ ڈھک جائے گا اور پھر آپ سوچیں گے کیا لکھا تھا؟ اور اب کیا لکھنا ہے؟

یہ چیز ہم نے کاتب حضرات سے سیکھی ان میں ہمارے مرحوم دوست منشی خلیق احمد ٹونکی اور سید عبدالوالی صاحب مرحوم (احاطہ کالے صاحب بلیماران) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں اپنے مسودوں میں اس سے بہت کام لیتا ہوں، میری ٹیبل پر قلم، پنسل، ربر اور فٹے کے علاوہ قینچی، گوند کی بوتل اور سفیدے کا پین بھی ضرور موجود رہتے ہیں۔

کتابوں کے نام قابل فہم اور آسان رکھنا

بعض ناشران کتب (پبلشر حضرات) سے یہ گُر سیکھا کہ کتابوں کے نام آسان اور جاذب رکھے جائیں، مشکل اور جس طبقے کے لئے کتاب لکھی جارہی ہے اسکی ذہنی اور علمی سطح سے اونچے نام نہ ہونے چاہئیں۔ آدمی نام دیکھے یا سنے تو فوراً سمجھ جائے کہ اسمیں کیا ہے، نام اسکی طبیعت کو کھینچ لے۔

مجھے یاد ہے دہلی چتلی قبر پر (خاص چتلی قبر سے ذرا آگے چل کر داہنی طرف درگاہ شاہ ابوالخیر سے پہلے) اونچی مسجد ہے ایک دوست امام صاحب کی وجہ سے کسی زمانے میں (سن ستر بہتر ۱۹۷۰ء-۱۹۷۲ء کے دوران) وہاں اکثر جانا ہوتا تھا، وہاں ظہر عصر وغیرہ کی نمازوں میں حضرت امام سید حمید صاحبؒ (سابق امام جامع مسجد، دہلی، وفات ۶ رفروری ۱۹۷۶ء امام عبداللہ بخاری مرحوم کے والد مرحوم) اپنی اخیر عمر میں آیا کرتے تھے تعارف ہوگیا تھا، انھوں نے اپنی ایک کتاب تحفۃً عنایت فرمائی ''وقائعِ عالم آخرت'' اس کا موضوع تقریباً وہی ہے جو مولانا عاشق الٰہی بلندشہریؒ کی کتاب ''مرنے کے بعد کیا ہوگا؟'' کا موضوع ہے۔ وہ اس وقت ہمارے والد کی عمر سے بھی زیادہ کے تھے، ہم نوجوان، ہم انہیں کوئی مشورہ دینے کی حیثیت میں تو نہیں تھے لیکن معذرت کے کچھ الفاظ ادا کرنے کے بعد میں نے ادب سے عرض کیا کہ ''حضرت کتاب ماشاء اللہ مفید ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہدایت ہے موت کو اکثر یاد کیا کرو أکثروا ذکر هاذم اللذات۔ اس مقصد کے لئے اچھی ہے مگر اس کا نام ذرا عام فہم ہوتا تو اچھا تھا''

انھوں نے کیا جواب دیا یہ تو اب یاد نہیں لیکن یہ نکتہ ہم نے ناشران کتب ہی سے سیکھا تھا، خاص طور پر حکیم مصباح الدین مردانی مرحوم (ربانی بکڈپو، لال کنواں، دہلی) سے۔ اسی مسجد میں عموماً ظہر عصر کی نمازوں میں جماعتِ اسلامی کے اس وقت کے امیر مولانا محمد یوسف بن تفضل حسین صاحب مرحوم (پیدائش ۱۹ رجنوری ۱۹۰۸ء۔ وفات ۴ر

جولائی ۱۹۹۱ء) بھی آیا کرتے تھے اور اکثر اذان کے وقت یا اس سے بھی پہلے آ کر خاموشی سے بائیں طرف اخیر میں بیٹھ جاتے تھے اور ہمیشہ بالکل اکیلے آتے تھے۔

میں ان سے واقف نہیں تھا کسی کے بتانے سے پتہ چلا تو ان کی سادگی اور وقت سے بہت پہلے مسجد آ جانے کی عادت اور بہت سکون سے نماز پڑھنے کے معمول سے دل میں ان کی قدر ہوئی۔ نہ خُدام کی فوج ساتھ میں، نہ کوئی ہٹو بچو، نہ کوئی تزک واحتشام، نہ کوئی کفش بردانہ خدمت گار۔ رحمہ اللہ

یہ سن ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۲ء تک جماعت اسلامی (ہند) کے امیر رہے تھے۔

کتابیں بھی بڑا محسن ہیں

ہم جن کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں وہ ہماری بہت بڑی محسن ہیں، ان مصنفین نے اپنی زندگیاں، اپنی قیمتی جوانیاں، اپنے شب و روز کے قیمتی لمحات، اپنا آرام و راحت، اپنی بہترین صلاحیتیں کھپا کر جو کتابیں تیار کی ہیں وہ کتابیں اور وہ مصنفین ہمارے استاذ اور ہمارے عظیم محسن ہیں ان کا احسان مانیں، ان کے لئے دعاء مغفرت کریں، ان کے لئے کبھی کبھی ایصال ثواب کر دیا کریں، زیادہ نہ ہو تو سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص پڑھ کر ہی ثواب پہنچا دیں، ہم اپنے محسن کے احسان پر شکریہ! تھینکیو وغیرہ کہتے ہیں جزاک اللہ کہتے ہیں، ان مصنفین کیلئے کبھی کچھ کیا؟ جن کی کتابیں پڑھ کر آپ عالم فاضل ہو گئے، مراتب بلند پر فائز ہو گئے، دنیا و دین کی نعمتوں کے حقدار بن گئے؟ اگر ابتک کچھ نہ کیا ہو تو آج اور ابھی کر لیجئے، روک لیجئے نگاہ کو اسی سطر پر اور دیجئے ثبوت احسان شناسی اور شکر گزاری کا۔ میں نے بھی قلم روک لیا ہے اور ایصال ثواب اور دعاء مغفرت و بلندی درجات کر رہا ہوں، آپ بھی یہ کام کر کے آگے پڑھیں۔

شکرگزاری کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ جس مصنف سے استفادہ کرتے ہیں اس کا حوالہ دیدیں، مرحوم مولانا ابوالحسن علی ندوی کو آپ دیکھیں گے کہ اپنی بہت سی کتابوں میں انھوں کسی سے کوئی اقتباس ہی نہیں اگر کوئی خیال بھی لیا ہے تو اس کا حوالہ دیدیا ہے کہ اس کا بنیادی تصور فلاں صاحب سے لیا گیا ہے۔ ارکان اربعہ ص ۳۴ (حاشیہ) میں لکھتے ہیں کہ یہ مثال فلاں بزرگ سے ماخوذ ہے۔ ص ۲۲۷ (حاشیہ) میں لکھتے ہیں کہ یہ تمثیل فلاں صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ یہ ایک اچھا اور لائق اتباع طریقہ ہے، کئی بزرگوں کا مقولہ ہے: من بركة العلم أن يُنسَبَ القول إلى قائله ''علم کی برکتوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قول کو اسکے قائل کی طرف منسوب کیا جائے''۔

(جامع بيان العلم لابن عبد البر النمري رحمه الله)

یہ بات تو ان کتابوں کی ہوئی جن سے ہم مضامین اخذ کرتے ہیں، لیکن کچھ کتابیں ہم زبان اور انداز نگارش سیکھنے کی غرض سے پڑھتے ہیں، بعض شعراء کا کلام ہم اپنی تحریر میں زور پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ تحریر کے درمیان ایک اچھا اور معیاری شعر اگر برمحل اور حسب موقع پیش کردیا جائے تو وہ مضمون کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچادیتا ہے، اس میں یہ تو سلیقہ آپ کا ہوا کہ آپ نے اس کو برمحل فٹ کردیا اور آپ کے حافظے اور استحضار ذہن کی خوبی ہوئی کہ آپ کو بروقت وہ یاد آگیا، لیکن کیا آپ کو اس شاعر کا ممنون نہیں ہونا چاہئے؟ کہ اس نے برسوں یا صدیوں پہلے آپ کے دل کی بات بہت موزوں انداز میں نظم کردی تھی؟

دیکھنا تقریر کی خوبی کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسلئے ان شعراء کے لئے بھی دعاء خیر کیجئے۔

بیعت وسلوک

اب تک کی گفتگو قرطاس وقلم اور کتاب وسفینہ سے متعلق تھی لیکن موجودہ عنوان کا تعلق سینہ بسینہ اور چشم نم وسینۂ گرم سے ہے۔ اب تک کا بیان علم کا تھا تو یہ روحِ علم کا بیان ہے، وہ بادام کی باتیں تھیں تو یہ روغن بادام کا ذکر ہے، اب تک بات پھولوں کی تھی اب بات خوشبو کی ہے۔ یہ قال کا نہیں حال کا موضوع ہے ؎

قال را بگزار مردِ حال شو پیشِ مردے کاملے پامال شو

(رومیؒ)

اسلئے اس میں لمبی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے، اس سلسلے کا کچھ ذکر میں ''شجرۂ طیبہ'' (شائع شدہ ۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۱ء) اور کچھ حاشیۂ فوائد الفؤاد اور اسکے مقدمہ میں کر چکا ہوں (زیر طبع) اور یہ موضوع اپنی عظمت وتقدس کے لحاظ سے مذکورہ اور آئندہ ساری گفتگو سے زیادہ اہم ہے۔

میں نوعمری کے بے سوچے سمجھے اقدام کے تحت ایک صاحب سے بیعت ہو گیا تھا جس میں میری مرضی کو کم اور اُن صاحب کی مرضی کو زیادہ دخل تھا، بلکہ ان کا ارتجالی حکم تھا یعنی نمازِ مغرب کے بعد وہ کسی کو بیعت کر رہے تھے میں بھی وہاں موجود تھا انھوں نے مجھ سے کہا کہ آؤ تم بھی مرید ہو جاؤ! میں ہو گیا۔ اس کے لئے نہ غور وخوض ہوا تھا نہ استخارہ کیا تھا۔ یہ واقعہ سن ۱۹۶۵ء کے تقریباً اخیر کا ہے۔

اس کے بعد حسبِ توفیق الٰہی میں کچھ معمولات کی پابندی تو کرتا رہا اور میں اس دوران اللہ تعالیٰ کو براہ راست اپنا مرشد تصور کرتا رہا اور ہر معاملے میں خود کو اس کے سامنے جواب دہ مانتا رہا (اور اسی حقیقت کا استحضار اصل شے ہے) لیکن اک تشنگی رہتی تھی، چنانچہ

اس کے تقریباً تیس (۳۰) برس بعد میں نے ایک بزرگ کے یہاں جانا آنا شروع کیا یہ ایک معمر عالم اور صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے۔ مغربی یو پی کے ایک قصبے میں رہتے تھے۔ یہ سن ۹۵-۱۹۹۶ء کی بات ہے۔

اِس سلسلے کا ایک عجیب تجربہ

انہی ایام میں ایک دن عشاء کے بعد تنہا کمرے میں، بتی گل، بند آنکھوں میں بیٹھے ہوئے میں کسی وِرد میں مشغول تھا کہ بغیر غنودگی کے، بین النوم والیقظہ نہیں بقائمی ہوش و حواس دیکھا ایک نورانی وجیہ و شکیل صورت نمودار ہوئی اور پھر ؎

وہ دیکھا جو دیکھا نہ تھا خواب میں
سنا وہ جو وہم و گماں میں نہ تھا

(بیدم شاہ وارثیؒ)

میں نے سلام عرض کیا، جواب کے بعد یہ گفتگو ہوئی:

وہ بزرگ : تم فلاں قصبے میں کیوں جاتے ہو؟ (اندازِ گفتگو سے کسی قدر ناپسندیدگی ظاہر ہو رہی تھی)

راقم : یونہی ایک بزرگ عالم ہیں اسلئے کبھی کبھی چلا جاتا ہوں!

وہ بزرگ : تم مرید ہو انکے؟

(میں واقعی یہ سوچے ہوئے تھا کہ چند ملاقاتوں کے بعد اگر دل مطمئن ہوا تو استخارہ کر کے مرید ہو جاؤں گا، وہ صاحب میرے والد صاحبؒ کے بھی ملنے والوں میں تھے، اور بڑے سنجیدہ و متین شخص تھے)۔

راقم : نہیں! مرید تو نہیں ہوں!

وہ بزرگ : ہم پیر کیسے ہیں؟

راقم : بہت بہتر!

اِس واقعے کے بعد میں ان صاحب کے یہاں نہیں گیا اور اس کے بعد پھر یہ ہونے لگا کہ بہت سے معاملات میں مجھے خوابوں کے ذریعے بہت واضح رہنمائی دی جانے لگی، کبھی قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ خواب میں رہنمائی دی جاتی جو حیرت ناک حد تک لفظ لفظ مطابق ہوتی تھی اور کبھی کبھی وہ بزرگ بھی تشریف لاتے اور رہنمائی دیتے تھے۔وہ کون ہستی تھی انھوں نے یہ بھی بتایا تھا مگر میرے لئے سکوت بہتر ہے۔اس کے بعد کچھ اتفاقات کے پردے میں میری دو چار نیازمندانہ ملاقاتیں خورجہ ضلع بلند شہر (یو پی) کے ایک درویش صفت بزرگ حضرت قاضی صوفی محمد شفیع صاحب چشتی صابری صاحبؒ (م ۱۴۲۹ھ-۲۰۰۸ء) سے ہوئیں، یہ سن ۱۹۹۶ء کے اوائل کی بات ہے۔

ایک شب پھر اسی طرح عشاء کے بعد وہ نورانی شکل نظر آئی اور فرمایا: تم قاضی جی سے مرید ہو جاؤ! میں نے عرض کیا: میں تو پہلے سے آپ کا مرید ہوں! فرمایا: وہ ہمارے ہی آدمی ہیں، چنانچہ میں نے ان کے صاحبزادے صاحب کے ذریعے اپنی درخواست حضرت قاضی جیؒ تک پہنچائی، میں ڈر رہا تھا کہ وہ انکار نہ فرمادیں اسلئے کہ درویش صفت بزرگ علماءِ ظاہر سے ذرا بچتے ہیں کیونکہ وہ درویشوں کی بہت سی باتوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں، وہ اس دن اتفاق سے ہمارے غریب خانے کے قریب ہی ایک صاحب کے یہاں حضرت نظام الدینؒ میں آئے ہوئے تھے، اللہ کا شکر کہ انھوں نے تامل نہیں فرمایا اور میں ۱۵/اپریل ۱۹۹۶ء کو اس سعادت سے بہرہ ور ہو گیا۔

پیر حضرات اپنے مریدین کو کچھ نہ کچھ پڑھنے کے لئے بتایا کرتے ہیں لیکن ہر مرید کو چلّے، وظیفے اور سخت مجاہدے نہیں کرائے جاتے ع

''دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر''

مرید کا شوق، ہمت، حالات و مصروفیات اور صحت وغیرہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے، حضرت قاضی صاحبؒ نے ہمیں کئی سال تک اوراد و وظائف اور سخت مجاہدے کرائے، ترک حیوانات جمالی اور جلالی کے ساتھ بھی کئی وظیفے کرائے اور پھر خلافت سے نوازا، پھر ۲۸/ربیع الاول سن ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۱/جون سن ۲۰۰۱ء کو دوبارہ خصوصی خلافت سے نوازا۔ پھر از راہ نوازش ۵/مئی ۲۰۰۲ء کو استاذ محترم حضرت مفتی مظفر حسین صاحبؒ نے، اور ۸/جون ۲۰۰۱ء کو حضرت مولانا سید جلیل حسین میاں صاحبؒ (دیوبند) نے اور ۲/جون سن ۲۰۱۵ء کو حضرت قاری مہر الٰہی صاحب جلال پوری مدظلہٗ (بلند شہر۔ یوپی حال مقیم مسوری ضلع غازی آباد، یوپی) نے اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا، سچی بات تو یہ ہے کہ

''من آنم کہ من دانم''

لیکن امید ہے کہ ان تمام حضرات کے اعتماد کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی کچھ نوازشیں ضرور ہوئی ہونگی اور ہوتی رہتی ہونگی ان شاء اللہ اور لگتا ہے کہ ہوتی ہیں۔ والحمد للہ علی ذٰلک۔

ہمارے محسنین کی ایک اور قسم ہمارے ناقدین اور مخالفین

ہم لوگ عام طور پر اپنے ناقدین کو پسند نہیں کرتے حالانکہ وہ بھی ہمارا ایک بڑا کام انجام دیتے ہیں، کوئی نہیں چاہے گا کہ میں باہر نکلوں اور میرے چہرے پر کوئی گندگی لگی ہوئی ہو، اوپر کا بٹن نیچے کے کاج میں لگ گیا ہو، شیروانی کے میرے کاندھے پر کسی پرندے کی بیٹ لگی ہوئی ہو، اسی لئے تو ہم آئینہ دیکھتے ہیں، آئینہ ''خاموشی سے بغیر شور

مچائے'' ہمارا عیب ہمیں بتا دیتا ہے، اور ہم اس عیب کو دور کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ناقدین بھی ہمیں آئینہ دکھاتے ہیں تاکہ ہم اپنے عیوب سے باخبر ہو جائیں اور انہیں دور کرلیں۔

میں نے اوپر کی سطر میں کہا ہے کہ ''خاموشی سے بغیر شور مچائے'' اصل تکلیف دہ بات یہی ہوتی ہے ہم اپنے عیبوں کا اشتہار پسند نہیں کرتے، بغیر اشتہار کے کوئی چپکے سے ہمیں بتادے تو اچھا ہوتا ہے، اسی لئے مومن کو مومن کا آئینہ کہا گیا ہے المؤمن مرآة المؤمن (رواه الطبراني في الأوسط والضياء في المختارة والبزار و القضاعي عن أنس رضي الله عنه، والبخاري في الأدب المفرد وأبوداود عن أبي هريرة رضي الله عنه- كما في الجامع الصغير ۲۱۶/۲، ۲۱۵، وبمعناه رواه الترمذي عن أبي هريرة رضي الله عنه كما في الجامع الصغير ۲/۲۱۶)

تاہم اگر کوئی شور مچا کر بھی آپ کی خامی بتا رہا ہے تب بھی اُسکی غلطی اسکے ساتھ آپ اس سے فائدہ تو اٹھا ہی لیجئے یعنی اپنی کمی اور نقص کو دور کر لیجئے۔

ہمارے دوست اور ہمدرد اور ہم سے اچھا گمان رکھنے والے ہمارے عیبوں پر زیادہ نظر نہیں رکھتے لہٰذا اُن سے ہمیں اپنی خامیاں دور کرنے میں مدد نہیں ملتی، اسی لئے کہا گیا ہے

؎

وعين الرضا عن كل عيب كَلِيلة
ولكنَّ عين الحقد تُبدي المساويا

(پسندیدگی کی آنکھ ہر عیب سے اندھی ہوتی ہے لیکن نفرت و دشمنی کی نگاہ چھپی ہوئی برائیوں کو بھی سامنے لے آتی ہے)

البتہ ہمارے مخالفین اگر انصاف سے کام لیں تو مضر نہ ثابت ہوں۔ لیکن جذبہ

مخالفت کا ہوتا ہے اسلئے وہ عیوب چپکے سے اور تنہائی میں نہیں بتاتے۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ملفوظات میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص نے بھری مجلس میں ان کی کسی بات پر اعتراض کیا، انھوں نے اس سے کہا:

''تم نے مجھ سے یہ بات جو کہی ہے دو حال سے خالی نہیں، یا تو تم نے حق کی خاطر کہی ہے، یا مجھے ایذاء دینے کے لئے۔ اگر تم نے یہ بات حق کی خاطر کہی ہے تو چونکہ تم نے سب کے سامنے کہی ہے اسلئے تمہیں اس پر کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ اور اگر یہ بات تم نے مجھے اذیت دینے کے لئے کہی ہے تو تم پر افسوس ہے، تم پر افسوس ہے اور تم پر افسوس ہے۔''

(فوائد الفؤاد حصہ ۴ مجلس ۱۷۔ ج ۲ ص ۱۰۲ بتحقیق محمد عبد اللہ طارق)

تاہم اگر ہماری طبیعت میں سلامتی ہے تو اس بات کو ٹھنڈے دل سے سمجھیں غور کریں اور کوئی بات ہمارے کام کی ہو تو لے لیں ورنہ اس طرف سے ذہن کو ہٹالیں، عربی کی ایک کہاوت ہے خذ ما صفا و دَع ما کَدِر (جو اچھا ہے لیلو جو گدلا ہے اسے چھوڑ دو) سامنے والے کا جذبہ کچھ بھی سہی آپ تو اپنے فائدے پر نظر رکھئے۔

چنانچہ بہت سے حضرات اپنا مضمون یا کتاب لکھنے کے بعد اپنے کسی قریبی صاحب علم شخص کو دکھاتے ہیں کہ اسمیں کوئی بھول چوک اور غلطی ہو تو بتادیں، ہم نے اپنے استاد شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ سے سنا تھا کہ وہ اپنی کتابوں کی تالیف کے دوران مدرسہ مظاہر علوم کے اسوقت کے اساتذہ حضرت مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم) اور دیگر حضرات سے مشورہ رکھتے تھے۔

موجودہ دور کے مصنفین میں بھی بہت سے حضرات کا یہ طریقہ ہے کہ وہ تصنیف کے دوران بھی اور کتاب مکمل ہونے کے بعد بھی کسی صاحب علم کو دکھا لیتے ہیں اور اچھا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس پر کچھ مناسب نذرانہ بھی پیش کرتے ہیں۔

اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی غیروں کا ہدف تنقید بننے سے پہلے ہی اپنے داغ دھبے اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں کے ذریعے دور کرالیتا ہے اور اس طرح صرف خامیاں ہی دور نہیں ہوجاتیں بلکہ بسا اوقات ان ذی علم دوستوں سے مفید مشورے بھی مل جاتے ہیں جن کے ذریعے آپ اپنے مضمون اپنی کتاب اور اپنے مقالے کو مزید قیمتی بنا سکتے ہیں۔

خالص دشمن بھی محسن ہیں؟

جی ہاں ذرا توسع سے کام لیجئے تو صرف خودغرضی اور حسد میں آپ سے دشمنی رکھنے والے بھی اس معنی میں آپ کے محسن ہیں کہ وہ آپ کی آنکھیں کھولتے ہیں، آپ کو زندگی کا تجربہ دیتے ہیں، انسانوں کی شناخت کا سبق دیتے ہیں، میں آپ کو اپنی ایک ''آپ بیتی'' سناتا ہوں ایک صاحب (اللہ بخشے اب وہ دنیا میں نہیں ہیں) میرے بہت ہی قریبی اور بہت زیادہ محبت وعقیدت رکھنے والے بن گئے تھے، اور شروع میں واقعی وہ ہمدرد اور بہی خواہ تھے، زمینوں کے کاروبار سے متعلق تھے، ہم سے تو ان کے ایک عرصے تک بہت اچھے تعلقات تھے لیکن لوگ انکو نہایت فریبی مکار اور بے ایمان کہتے تھے۔

میں نے بھی ان سے کچھ زمین خریدی دو چار قسطوں میں رقم ادا کردی، قسطوں کی رسید بھی میں لیتا رہا اور جب پوری رقم ادا ہوگئی تو پوری رقم کی رسید بھی لے لی اور علاقے کے دو ذمہ دار حضرات کے دستخط گواہی میں لے لئے، جن میں سے ایک صاحب اس علاقے کی

جامع مسجد کے امام صاحب بھی ہیں، اور یہ دونوں حضرات الحمد اللہ آج بھی موجود ہیں۔

دیکھا آپ نے! میں نے ساری کارروائی ٹھیک کرلی تھی، چند سال کے بعد بعض خاص اسباب کے تحت اس زمین کے دام بہت بڑھ گئے، اب انکو خیال آیا کہ یہ زمین واپس لے لوں، میں نے ابھی اس پر کچھ بنایا نہیں تھا چنانچہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! یہ زمین خطرے میں ہے، گورنمنٹ کی فلاں اسکیم کے تحت یہ زمین جانے والی ہے آپ اپنی رقم واپس لے لیں میں کسی اور کو بیچ دوں گا۔

میں جانتا تھا کہ خطرات تو کچھ نہ کچھ منڈلاتے ہی رہتے ہیں مگر ایسی کوئی خاص بات نہ تھی، میں نے کہا حاجی صاحب! جو معاملہ ہو گیا ہو گیا، جو مقدر ہے ہو جائے گا بس یونہی رہنے دیجئے، مگر وہ اصرار کرتے رہے میں ٹالتا رہا۔ وہ بار بار کہتے کہ میں عمرے کو جا رہا ہوں رقم گھر میں رکھی ہے لے لیجئے، میں نے کہا آپ اسے بینک میں رکھ جائیں یہ زمین مجھے رکھنی ہی ہے۔

جب انھوں نے سیدھی انگلی سے گھی نکلتا نہ دیکھا تو انگلیاں ٹیڑھی کیں، عقیدت و محبت کو طاق پر رکھ دیا اور انھوں نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ مولانا صاحب میری اتنی رقم کھا گئے ہیں، اللہ کا کرم ہے لوگوں میں ایک اعتماد اور نیک گمان ہے لوگ یقین نہ کرتے تھے اور لحاظ مروت میں میرے سامنے کوئی ذکر بھی نہ کرتا تھا۔

آخر ایک ملنے والے نے کہا کہ حضرت! آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں اور پھر انھوں نے وہ بات مجھے بتائی، میں نے کہا آپ نے اچھا کیا مجھے بتا دیا، میں نے ان کو حقیقت حال بتائی اور پھر میں نے اس فائنل تحریر کی چند فوٹو کاپیاں کرا کے، کئی لوگوں کو دیدیں امام صاحب مذکور نے کہا مجھے بھی دیدیجئے مجھ سے بھی بعض لوگوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے۔ میں نے سب کو بتایا کہ آپ ان کے دستخط پہچانتے ہیں نا؟ وہ پہچانتے تھے،

مجھے ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں پڑی اور الحمد للہ وہ فتنہ خود بخود دب گیا۔

اس سے ہمارا یقین جو الحمد للہ پہلے سے تھا حق الیقین اور مشاہدہ ہوگیا کہ سورہ بقرہ کی آیت مُدَاینَت (آیت نمبر ۲۸۲) پر ضرور عمل کرنا چاہئے، ہر لین دین کی لکھت پڑھت ضرور کرنی چاہئے خواہ فریقین میں باہمی اعتماد کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اس کے بعد بھی وہ اور ان کے خاندان کے افراد دشمنی پر آمادہ رہے، آخر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے چند سے روئے زمین کو اور چند سے علاقے کو صاف کردیا۔ و کفی باللہ و کیلا اور کفی اللہ المؤمنین القتال و کان اللہ قویا عزیزا۔

دشمن آپ کو تجربہ دے کر جاتا ہے، آئندہ چوٹ نہ کھانے کا سلیقہ سکھا جاتا ہے، آپ صبر کرتے ہیں تو اجر کے حقدر ہوجاتے ہیں لا یلدغ المومن مِن جُحرٍ مَرَّتَین (مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا)

(احمد، بخاری، مسلم، ابوداود، ابن ماجہ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)

یہ ارشاد نبوی جو سنا ہوا ہوتا ہے اب مشاہدہ اور تجربہ بن جاتا ہے۔

عنوان میں ہم نے اپنے علمی سفر کے رفقاء معاونین اور محسنین کا ذکر کیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ہر لمحے ہم کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں، ہر قدم ہمیں سبق دے کر جاتا ہے، سبق بڑوں ہی سے نہیں چھوٹوں سے بھی ملتے ہیں حتی کہ جانوروں سے بھی ملتے ہیں آخر حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے نے اپنے بھائی کی لاش کو دفن کرنے کا طریقہ کوّے سے ہی سیکھا تھا حتی کہ پیڑ پودوں اور درختوں میں بھی اسباق چھپے ہوتے ہیں ؎

تامّل سطورَ الکائنات فإنها
مِن المَلِکِ الأعلیٰ اِلَیک رسائل

(کائنات کی سطروں میں غور کیا کرو یہ بڑے شہنشاہ رب العالمین کی طرف سے

تمہارے لئے بھیجے ہوئے پیغامات اور خطوط ہوتے ہیں)۔

آپ اگر اپنے محسنین کی کوئی فہرست بنائیں تو ممکن ہی نہیں ہے، شہد کی مکھی آخر کیسے بتا سکتی ہے کہ میں نے فلاں عرصے میں کتنے پھلوں، کتنے پھولوں، کتنے حلوائیوں کے کتنے تھالوں، کتنے ٹھیلوں پر رکھے ہوئے میووں، گنڈیریوں، گڑ کی منڈیوں کی کتنی بھیلیوں سے رس چوسا ہے۔

بس اپنے تمام محسنوں کے شکر گزار رہئے ان کے لئے دعاء خیر کیجئے اور ہر محسن سے بڑے محسن حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے بھی بڑھ کر اصل اور اعلیٰ محسن خالق کائنات تعالیٰ شانہ کا سب سے زیادہ شکر کیجئے جو فرما چکا ہے کہ وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے) اور سچ تو یہ ہے کہ تمام محسنوں کے دل میں کسی کے لئے جذبۂ احسان وہی پیدا کرتا ہے ورنہ کوئی انسان کسی کو کچھ بھی نہ دے ؎

کوئی انسان کسی انسان کو کیا دیتا ہے
آدمی اک بہانہ ہے خدا دیتا ہے

والحمد للہ اوّلاً و آخراً!
والصلاة والسلام علی سیدنا محمد و آلہ
و اصحابہ اجمعین۔

نوٹ

بختیار پبلیکیشنز

Bakhtiyar Publications

S/9A, Str. No.18, Opp.Mumtaz Masjid, Nafees Road,
Joga Bai Ext., Jamia Nagar, New Delhi - 110025
email : bakhtiyarpublications@gmail.com
Cell / Whatsapp : +91 9953122348

Price : Rs.100.00 (INDIA)
USD.3.00 (ABROAD)